گلیاں پریم نگر دیاں

کنیز بنوی

کنیز نبوی

"مکلی اور ساموئی (سات درویش) کی قسم! شاہ کی سوہنی اور ماروی کی قسم 'سندھ جاگے پئیں ہے۔ (سندھ جاگ رہا ہے۔)" تالیوں کا شور اٹھا' اور سب کچھ اسی شور میں مدغم ہوا۔ اسٹیج پر بیٹھے سازندوں نے ہاتھوں سے بولیاں شروع کردیں۔ اور گلوکار کی انگلیاں ہارمونیم کے بوسے لینے لگیں۔

جنت الفردوس آہن بئے کندھیوں مہران جوں

یہ رگو واکھا نجن بیلا بنیوں مہران جوں

(مہران کے دونوں کنارے جنت الفردوس کی مثل ہیں۔ اس دھرتی کے بیلے اور کھیتوں کو دیکھنے والے مبہوت ہو کر رطب اللسان رہتے ہیں۔)

وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسٹیج کے سامنے والی کرسیوں پر آبیٹھا۔ سندھی زبان کا پہلا چینل لانچ ہوا تھا۔ اس کے تحت ہر بڑے شہر میں میگا شوز رکھے گئے تھے۔ لوگوں کا شوق دیدنی تھا۔ لگتا تھا کہ سارا حیدر آباد اٹھ آیا ہو۔ گلوکار سندھ کے باسیوں کی شان بیان کررہا تھا۔

"وہ دیکھو مہران کی لاڈلیاں۔ کس لاڈ سے جھومتی آرہی ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ سجا کے' بال سنوار کے یہ اونچی گردنوں والی کامنیاں' پانی بھرنے والی پدمنیاں' کسی نے نتھ پہن رکھی ہے۔ تو کسی نے پانی بھرنے والا وِندھا (جس پر مٹکے جماتے ہیں۔) سر پر جمایا ہوا ہے۔

مکمل ناول



سب کے سروں پر بیلھڑے (دوہرے مٹکے) دھرے ہیں۔ یہ سات رنگوں کے سنگار کرنے والیاں ہاتھ مونہہ دھو کے ہاتھوں کو زیور سے آراستہ کر کے جہاں سے گزرتی ہیں راستوں اور گلیوں کو گلزار بنا دیتی ہیں۔"

سرمد بڑی محویت سے اس کو سن رہا تھا' تبسم کے کنول اس کے ہونٹوں پر کھلتے جا رہے تھے۔

ماروی نے اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے اس کی طرف توجہ کی۔ نگاہوں کے اتصال پہ ان کے لب ہی نہیں دل بھی مسکرائے تھے۔

گلوکار اب سندھ کے سپوتوں کی تعریف کر رہا تھا۔

"یہ گھاس کاٹنے والے بہادر سپوت۔ جو اجرکیں پہن کر گھومتے ہیں' جن کی ٹوپیوں پر موتی اور شیشے چمکتے ہیں۔ جن کے جسموں کی بناوٹ ایسی خوب ہے کہ ان کو دیکھتے ہی حسن کے شوق ماند پڑ جاتے ہیں۔"

ان کی نظروں اور مسکراہٹ کا بے ساختہ ملاپ ہوا۔ سارا گراؤنڈ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ خوشی ہجوم کے دلوں میں جھوم رہی تھی۔

ان دونوں کے ہاتھ تالیوں کے ردھم میں شریک ہو گئے۔ گلوکار نے اسی جذبے سے اگلا بند گانا شروع کر دیا۔

جن کے جری اور جوان بیٹے' خون سے کھیلنے والے بہادر بیٹے' سرویش و سروان (رہبر) بیٹے۔ اک اک کے پہاڑ ایسے جگر' اک اک پتھروں کو پاش پاش کرنے کی طاقت رکھتا ہے' دیکھنا چاہو تو اک اک کی مستی کو مہران کی مستیوں میں دیکھو۔

سارا مجمع کھڑا ہو کر تالیاں بجا رہا تھا۔ مگر ماروی کی نگاہوں میں کارو نجھر جیسے سربلند شخص کا وجود گھومتا رہا۔ اس کا سینہ پتھروں جیسے ظالموں' غاصبوں کو پاش پاش کرنے والا تھا۔ وہ لوہے سے زیادہ مضبوط شخص جس نے فرسودہ مردہ نظام سے بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے۔

"وہ ظلم جہاں بھی ہو گا' میں اس کے خلاف لکھوں گا' بولوں گا' لڑوں گا' اپنے باپ کی طرح جان دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔" سیکڑوں بار کیا گیا اس کا عزم ماروی کے سماعتوں میں تازہ توانا تھے۔

گانا ختم ہونے پر بے تحاشا تالیاں بجا کر گانے والے کو داد دی گئی۔

"زندگی کے زندان میں تم وہ روشن دریچہ ہو جس سے محبت و مسرت کی آکسیجن پا کے میں جینے کی ہمت کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ نے مجھے امید کی منڈیر پر ایمان کے دیے جلانے سکھائے ہیں۔"

اس کی طرف جھک کر بلند آواز سے اظہار کو بھی مجمع کے شور نے سرگوشی بنا دیا۔

"کیا محبت واقعی انسان کو اتنا طاقت ور بنا دیتی ہے؟"

اس نے سوچتے ہوئے کھلتے لبوں اور چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ پر رکھے سرمد کے ہاتھ کا دباؤ اس کی محبت کی طرح ہی بڑھتا چلا گیا۔

✲ ✲ ✲

سردیوں کی زرد شام صحن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مہو نے دروازہ کھولا تو جسم پر تھرتھرائی سردی نے کپکپی طاری کر دی تھی۔

فوراً" دروازہ بند کر کے وہ پلٹی اور سوئیٹر اٹھا کر پہن لیا۔ چائے کی طلب شدید ہو رہی تھی۔ وہ دوپٹہ اچھی طرح لپیٹتی کان چھپاتی باہر نکل آئی۔

باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے وہ ابھی بیچ صحن میں ہی تھی کہ اس کے قدم رک گئے۔

اختیار اجرک میں لپٹے ایک نسوانی وجود کو بازو سے پکڑے آ رہا تھا۔

اس کے دل میں دھڑکن کی جگہ خوف نے لے لی۔

"کیا یہ جرگے والی لڑکی ہے؟" وہ ساکت ہو کر یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

"مہو! یہ تیری تیسری بھابھی ہے فائزہ!" انگوٹھے اور بیچ کی انگلی سے مونچھیں سنوارتے اختیار کی مسکراہٹ اسے زہر لگی۔

سر جھکائے آنکھیں زمین پر گاڑے کھڑی فائزہ پر اسے بے تحاشا رحم آیا۔

"لے جا اسے اپنے کمرے میں۔" اختیار نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہاتھ کو اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے بے دلی سے اس کے یخ ہاتھ کو تھاما اور کمرے میں آ گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔

"میں مہو ہوں' اختیار کی بہن۔" اس نے کہا۔ وہ خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

"تم بیٹھو' میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔" وہ باہر نکل آئی۔ چولہے پر چائے کی کیتلی رکھتے ہوئے اس نے دیکھا' اختیار کی دوسری بیوی اپنے چھ سالہ بیٹے کو خوامخواہ مار رہی تھی۔ سوکن کا صدمہ اس کے لیے نیا تھا۔ جبکہ اس کی پہلی بیوی اس چوٹ کا زخم پہلے ہی سہہ چکی تھی۔ سو وہ صرف خاموشی سے سب کے چہرے تکتی رہی۔

مکمل بے بسی اور لاچاری کی عملی تصویر بنی اختیار کی پہلی بیوی' سوکن کا تازہ تازہ صدمہ سہنے والی اس کی دوسری بیوی اور باپ کو موت کے کالے کنوئیں سے بچانے والی اس کی تیسری بیوی فائزہ۔

"اور فدا حسین کی بے ضرر سی بیوی' جو سارا دن کام اور ذمہ داری میں جتی رہنے والی بھابھی۔ اسے اچانک اس سارے ماحول سے شدید نفرت محسوس ہوئی خود سے بھی۔ جو اس ماحول کا حصہ تھی۔

اس نے اضطراب سے جلتی لکڑی اٹھا کر دوسری لکڑی پر دے ماری۔ شعلہ ذرا سا بلند ہوا' چنگاریاں اٹھیں اور جلتا کوئلہ لکڑی سے ٹوٹ کر اڑتا اس کے پیر پر آ گرا۔ جلن کے احساس پر وہ ایک دم سے ماحول میں واپس آ گئی۔ کوئلہ پھینک کر چائے پیالیوں میں ڈالی۔ اور ٹرے اٹھا کر سب کو چائے دینے لگی۔

اختیار اپنی دوسری بیوی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹرے اس کے آگے کی۔ اس نے اپنا مخصوص بڑا مگ اٹھا لیا۔ اس کی بیوی نے ٹرے میں سے کپ اٹھا کر ٹیبل پر پٹخنے والے انداز میں رکھا۔ وہ خاموشی سے مڑی۔

"مہو!" اختیار کی پکار پر وہ رکی۔ "تم اپنا بستر اٹھا کر باورچی خانے کی لانڈھی میں رکھ دو' فی الحال میں تمہارا کمرہ فائزہ کو دے رہا ہوں۔ جب اس کے لیے کمرہ بناؤں گا پھر تمہیں تمہارا کمرہ واپس مل جائے گا۔"

اس کے پیر پر جیسے کوئلہ گرا ہو۔ اس کی جلن بڑھ گئی۔ وہ خاموشی سے ٹرے میں بچے دونوں کپ اٹھا کر اپنے کمرے میں آئی' جواب اس کا نہیں تھا۔ غالباً" اختیار کی دوسری بیوی نے اپنا کمرہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بیٹے کی ماں تھی۔ جس بیٹے کے لیے وہ اپنی پسند سے اسے بیاہ کے لایا تھا۔ پہلی بیوی کی چار بیٹیاں تھیں' اس سے کمرہ لیتا تو چار بیٹیاں کہاں رہتیں' واحد وہی تھی جو تنہا کمرے کی مالک تھی۔ آج اس سے اس کی چھت چھین کر خانہ بدوش بنا دیا گیا تھا۔

اس نے ٹرے فائزہ کے سامنے رکھی' وہ ویسے ہی سر

چھکائے آنسو بہاتی رہی' جیسا وہ اس کو چھوڑ کر گئی تھی۔

"چائے پی لو' طبیعت بہتر ہو جائے گی۔" اس نے اپنا بستر تہ کر کے اٹھایا اور باورچی خانے کی لانڈھی میں پڑی چارپائی پر لا پھینکا۔ اور کیا چیزیں اٹھا کر لاؤں' اس نے غائب دماغی سے سوچا۔ وہ کمرے میں آئی تو فائزہ اسی زاویے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے واش روم سے منجن اور صابن اٹھایا۔ الماری سے شال نکالی اور کسی ضرورت کی چیز کو لینے کے لیے اس نے چاروں طرف نگاہ گھمائی۔

ٹرے میں چائے کے دونوں کپ پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اس کے دل میں بے تحاشا رحم امڈ آیا اس نے فائزہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"مت روؤ' یہاں آنسوؤں کی قدر کوئی نہیں جانتا' کیوں ضائع کر رہی ہو۔"

"میں کاری نہیں تھی۔ اللہ گواہ ہے میں کاری نہیں تھی۔" اس نے آنسو بھری آنکھیں مہو پر گاڑیں۔

"مجھے پتا ہے تمہارا قصور کاری ہونا نہیں عورت ہونا ہے' صرف عورت۔ اور صرف عورت ہونے کی سزا۔

باپ بھائی خون کریں قتل کریں اور بدلے میں لڑکی کا رشتہ دیا جائے ایک بے گناہ لڑکی کو مصلوب کر دیا جائے۔

سرمد نے اخبار میں رپورٹ کر دیا تھا۔ سنگ چٹی (خون کے بدلے لڑکی کا رشتہ)

جرگے میں شامل سرداروں کو غصہ آگیا۔ اور ایک رات ڈاکو' سرمد کے گھر سے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ زیب النساء پریشان ہو گئیں۔ سرمد کو گاؤں آنے سے ہی منع کر دیا۔"

زیب النساء نے یہ بات اسے تب بتائی تھی جب وہ ڈاکے کا سن کر اس کے پاس گئی تھی۔

"پتا ہے مہو! سرمد تو مان نہیں رہا تھا۔ کہتا تھا پولیس میں سردار کے خلاف مقدمہ درج کراؤں گا' اس نے ڈاکہ ڈلوایا ہے۔ مگر میں نے منتیں کر کے اپنی ممتا کے واسطے دے کر اسے روکا ہے' گاؤں آنے اور ایف آئی آر داخل کرنے سے۔" مہو خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

اس نے گھر آکر بھائیوں کو بتایا۔ مگر اس کے بھائی ریلی تان کر سو گئے۔ نہ پیچھا کیا' نہ پکڑا۔ وہ زیور' رقم' کپڑے حتیٰ کہ برتن اور ٹی وی وغیرہ بھی لے گئے تھے۔

البتہ اخبار میں چند دن اس خبر کا چرچا بھی رہا۔ سماجی' سیاسی حلقوں نے مذمت بھی کی۔ مگر ہوا کچھ نہیں کہ سردار کے خلاف کون ایکشن لیتا۔

✡ ✡ ✡

"تو مہو! تم سے یہ ٹھکانا بھی چھن گیا۔" وہ چارپائی پر بیٹھی اپنے ناخن کھرچتی رہی۔ اک کمرہ تھا اس گھر میں' وہ بھی گیا۔ اب دلدار سے بھاگنے کا بہانہ بھی نہیں۔ کوئی پناہ بھی نہیں' جہاں چھپ کر بیٹھ جاؤں۔ اسے ماں' باپ بے طرح یاد آئے۔ ماں تو بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ باپ کو فوت ہوئے بھی پانچ سال ہونے کو آئے تھے۔

اختیار کی تینوں بیویاں اپنے کمروں میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ دو تو گھر کے کسی کام کاج میں حصہ نہیں لیتی تھیں۔ ایک بھاجائی تھی' وہ روٹی سالن سب کے برتنوں میں ڈال کر رکھ دیتی۔

دونوں وقت چائے اور روٹیاں وہ بناتی۔ سالن بھاجائی بناتی۔ اختیار کی بڑی بیوی برتن مانجھتی اور جھاڑو لگاتی۔ دوسری بیوی پسند کی تھی اور اب بیٹے کی ماں اس کو تو کھانا بھی کمرے میں پہنچایا جاتا۔ رہ گئی نئی آنے والی فائزہ تو اسے اپنی بدقسمتی کا غم منانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔

دلدار دونوں ٹائم کھانا گھر میں کھانے لگا تھا۔ اب تو وہ کھانے کے بعد بھی بیٹھا رہتا۔

اس لیے مہو کا ٹھکانا اب یہی باورچی خانہ تھا۔ سردیوں کی سختی بڑھ رہی تھی' وہ اب ایک کی جگہ دو لحاف لینے لگی تھی۔

دلدار کے زیادہ دیر بیٹھنے کی وجہ سے وہ بھی کام کر کے بنی چارپائی پر جا بیٹھتی۔ تھکاوٹ کے باوجود وہ چارپائی پر بیٹ کر کمر سیدھی کرنے کی خواہش کو دبا دیتی۔ ورنہ پہلے روٹیاں پکانے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی تھی۔

دیر تک بیٹھنا' اوپر سے اس کی نظروں کا کھلا اور واضح پیغام اب تو جیسے وہ عادی ہو چلی تھی۔ اسے پہلے جیسی الجھن نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ دلدار کی جرأت بڑھنے لگی۔ جیسے ہی تنہائی ملی وہ کوئی نہ کوئی جملہ پھینک دیتا۔

"تم لال رنگ نہ پہنا کرو' دل سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دل کرتا ہے ابھی بارات لے آؤں۔"

"تم نے کالا جوڑا کیوں پہنا ہے' لگتا ہے قیامت آگئی ہے۔ مار ڈالے گا تمہارا یہ روپ مجھے' کبھی سوچتا ہوں خدا نے تمہیں اتنا حسین کیوں بنایا ہے۔ یا پتہ نہیں مجھے ہی اتنی حسین لگتی ہو۔"

وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔

وہ ہنسنے لگتا۔ "گھبراؤ نہیں' کوئی نہیں ہے۔"

وہ خاموش ہی رہتی' بھاجائی ہوتی تب بھی نہ ہوتی تب بھی۔

"کبھی تو اپنی میٹھی آواز سنا دیا کرو' ترس گیا ہوں سننے کو۔" آہستہ آہستہ اس کی ناگوار گزرنے والی باتیں اسے اچھی لگنے لگیں۔

سرمد کا ذکر گھر میں اس نے کبھی اچھے لفظوں میں نہیں سنا تھا۔ اس کی ماں کی تربیت تھی یا باپ کے خون کی تاثیر کہ وہ ہمیشہ چچا زادوں سے دور رہا تھا۔ شروع شروع میں جب اسے پتا چلا کہ وہ سرمد سے منسوب ہے تو اسے اچھا لگا۔

مگر سرمد نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ ہمیشہ اسے کتابوں میں گم ملتا۔ اسکول کے بعد وہ شہر کے کالج میں پڑھنے جاتا اور شام کو آتا' دو سال بعد حیدر آباد میں مستقل رہنے لگا تھا۔ وہیں اس کو ملازمت مل گئی۔ اخبار کی ملازمت کے بعد تو اس کو ہر وقت مکار اور مغرور کہا جاتا تھا۔

مہر کو پتا ہی نہ چلا کہ اس کا جھوٹ دراصل سچ' مکاری' سمجھداری اور غرور خودداری ہے۔

عورت ہمیشہ توجہ کی طلب گار ہوتی ہے۔ توجہ اسے کہیں سے بھی ملے' وہ کھنچتی چلی جاتی ہے۔ مرد کا نرم لہجہ' تعریف اور پیار عورت کو ہر قدم اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بالخصوص ایسی عورتوں کو جنہیں گھر کے اندر محبت' عزت نہیں ملتی۔ دلدار اسے محبت دے رہا تھا۔ عزت دے رہا تھا۔ وہ اب اس کی نظروں کے پیغام کو وصول کرنے لگی۔ اور اس کی جرأتیں عروج پر پہنچ گئیں۔

"کبھی تو تم میری باتوں کا جواب دے دیا کرو مہو!"

"کیا بات کروں' اگر گھر میں کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"کوئی نہیں دیکھتا میری جان! اتنا ڈرتی کیوں ہو؟"

وہ اس بے باکانہ انداز تخاطب پر گھبرا سی گئی۔

"مرواؤ گے تم مجھے۔"

"دلدار کے ہوتے ہوئے کوئی تمہارے سائے کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تمہاری خاطر ساری دنیا سے ٹکر لے سکتا ہوں مہو!"

اس کی آنکھوں کی تپش سے گھبرا کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

"تم... تم چلے جاؤ اب۔ بہت دیر ہو گئی۔ کسی کو شک نہ پڑ جائے۔"

"میں کہوں گا' میں چائے کا اک اور کپ پینے بیٹھ گیا ہوں۔ تم کیوں گھبراتی ہو پیاری! میں ہوں ناں' تمہاری ساری مشکلات سمیٹنے والا۔ کیوں ننھی جان پر دکھوں کا بوجھ لیے پھرتی ہو۔ دے دو سب دلدار کو۔ جو تیرے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔ تمہاری خوشیوں پر خود کو قربان بھی کر سکتا ہے۔"

اس کے لہجے سے ٹپکتا شہد۔ وہ ساری کی ساری میٹھی ہوتی رہی۔

خواہشات مکھیوں کی طرح اس پر بھنبھناتی رہیں۔ محبت سب سے پہلے عقل کے دروازے بند کرتی ہے۔

✡ ✡ ✡

ماروی شادی کے بعد پہلی میٹنگ اٹینڈ کرنے آئی تھی۔ میٹنگ کا ایجنڈا کاروکاری کے خلاف سیمینار کے مقام کا تعین تھا۔

"میرے خیال سے سیمینار کراچی کے بجائے حیدر آباد میں کرایا جائے۔" اول نے اپنی رائے دی۔

"آپ کیا کہتی ہیں مسز ماروی؟" ڈائریکٹر احسن آفندی نے اس سے رائے پوچھی۔

"سر! میرے خیال میں کاروکاری کی قبیح رسم جن علاقوں میں رائج ہے۔ وہاں پر سیمینارز ہونے چاہئیں۔ جیسے گھوٹکی، خیرپور، سکھر، شکارپور، جیکب آباد اور لاڑکانہ وغیرہ جہاں پر ان کیسز کی تعداد زیادہ ہے اور سرداری نظام بھی مضبوط ہے۔ کاروکاری سے جو اضلاع متاثر ہیں، سیمینار بھی وہیں ہونے چاہئیں۔" اس نے اپنی رائے دلیل کے ساتھ پیش کی۔

"بہت خوب ماروی صاحبہ! میں آپ کی رائے سے ہنڈریڈ پرسنٹ ایگری کرتا ہوں۔ اب یہ بتائیں کہ پہلا سیمینار کہاں کرایا جائے۔"

ڈاکٹر سہیل آزاد نے مسکراتے ہوئے تائید کی۔

"اول! آپ بتائیں؟" ماروی نے اس کی رائے پوچھی۔

"میرے خیال میں پہلے اس ضلع میں کیا جائے جہاں ہمیں آسانی ہو۔ پہلے لاڑکانہ میں کرالیں۔"

"سر! میرے خیال میں اول صحیح کہہ رہا ہے کہ پہلے لاڑکانہ میں کرتے ہیں۔ پھر باری باری دوسرے اضلاع میں۔" ماروی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تیاری شروع کردیں۔ مس ماروی! آپ اول کے ساتھ لاڑکانہ جا کر انتظامات سنبھالیں گی۔ کن کن این جی اوز اور دانشوروں کو بلانا ہے یہ بھی آپ کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں، اور سیمینار کے موضوع کے عنوان کا فیصلہ بھی آپ پر ہے۔"

"جی بہتر سر!" اس نے پھر ریسٹ واچ کی طرف دیکھا۔

"کسی کا انتظار ہے ماروی؟"

"سر! سرمد نے آنا ہوگا۔" اول نے چھیڑا۔

"آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔" ماروی ہنس دی۔

"لیجیے سرمد بھی آگیا۔" سہیل آزاد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی چائے شائے یار!" اول نے میزبانی سنبھالی۔

"نہیں اول! میں ماروی کو لینے آیا تھا۔ مگر لگتا ہے، ابھی میٹنگ ختم نہیں ہوئی۔"

"میٹنگ تو ختم ہے میں آج کراچی جارہا ہوں، اچھا ہوا کہ آپ آگئے تو ملاقات بھی ہوگئی، درحقیقت آپ دونوں کی لگن اور کام دیکھ کر مجھے بے حد حوصلہ ملتا ہے۔ آپ کی بے باکی اور بلا خوف رپورٹنگ سے میں بہت متاثر ہوتا ہوں۔"

"سہیل آزاد صاحب! سندھی میڈیا بہت طاقت ور ہے۔ لوگوں کا اس پر اتنا اعتماد ہے کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے، سردار کی اوطاق اور تھانے کے بجائے انصاف کے لیے پریس کلب کے سامنے آکر ٹھہرتے ہیں۔ اس ملک کے پسے ہوئے عوام کی بنیادی، انسانی، آئینی، جمہوری، سیاسی، معاشی، سماجی حقوق پر آواز اٹھانا صرف ہماری پروفیشنل اپروچ ہی نہیں زندگی گزارنے کا اعلا ترین مقصد بھی ہے۔"

سہیل آزاد نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "میں دعا کرتا ہوں اللہ، رب العزت آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"آمین۔" وہ سہیل آزاد کی دعا کے ساتھ آفس سے نکل آئے۔

"پھر چلیں یا کہیں باہر؟"

"نہیں گھر چلیں میں تھک گئی ہوں۔"

"کہیں باہر سے کھانا لے کر چلتے ہیں۔" سرمد نے اس کی تھکن دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ میں بنالوں گی۔ دو آدمیوں کا کھانا بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

"میں تو تمہاری ہی وجہ سے کہہ رہا تھا۔ ورنہ مجھے تو خود تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا اچھا لگتا ہے۔" وہ مسکرا دیا۔

"تو بس کھانا بھی میرے ہاتھ کا کریں۔"

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

☼ ☼ ☼

مرد اگر عورت کے اندر محبت کی خواہش کو بیدار کردے تو عورت سب کچھ بھلا دیتی ہے، معاشرے کے اندر پھیلے فساد کے دھوئیں، اور روایت کی آگ کو عزت کے نام نہاد بانوں کو اپنی محبت تلے روند کر ایک نیا جہان بسانے کی جستجو میں مگن ہو جاتی ہے۔

مہو نے بھی ولدار کی محبت میں سب کچھ بھلا دیا۔ چھپے دنوں کی آس میں، اور ایک چاہت عزت بھری زندگی گزرنے کی تمنا میں۔ وہ خواہشوں کے دھارے میں بہنے لگی۔

"تمہارے لیے بہت خطرات ہیں مہو! سرمد کا اوافدا حسین سے بات کرنا خطرے کی وارننگ ہے ہمارے لیے۔ ابھی تو اختیار میرا یار ہے، مگر جب اسے پتا چل گیا تو وہ میرا دشمن بن جائے گا۔"

"پھر تو کچھ کرنا دلدار! بھیج کسی کو رشتے کے لیے۔"

مہو کے لہجے میں فکر و خوف کے سائے اتر آئے۔

"ارے پاگل ہوئی ہے کیا۔ اسے اگر پتا چل گیا ہمارے پیار کا تو وہ مجھے قتل کرنے میں اک لمحہ بھی نہیں لگائے گا۔ ویسے بھی تیری بات سرمد سے پکی ہے اور میں تیری برادری کا بھی نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اختیار مان جائے۔ رشتہ لینے ادا اشرف کو بھیجوں گا تو الٹا تمہارے بھائیوں کی دشمنی شروع ہو جائے گی۔"

"پھر کیا ہوگا آخر ہماری محبت کا؟" مہو نے بےچارگی سے اسے دیکھا۔

"وہی ہوگا جو دو پیار کرنے والوں کے بیچ ہوتا ہے۔ بس تو تھوڑی ہمت کرلے، ادا اشرف سے بھی صلاح کی تھی۔ کہتا ہے میں سارا بندوبست کردوں گا، بس تو نکل لا۔ بول چلے گی نا میرے ساتھ؟"

اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ "دلدار! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر ادا کو پتا چل گیا نا تو ہم دونوں کو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔"

"محبت کرنے والے دنیا سے نہیں ڈرتے مہو!"

"ڈر تیرے ساتھ جانے سے نہیں لگ رہا۔"

"پھر کس بات سے لگ رہا ہے؟"

"تو!" وہ جھجک کر رک گئی۔

"ہاں۔ ہاں۔ کہو نا!"

"تو مجھے کہیں چھوڑ تو نہیں دے گا۔"

"ہاہاہا!" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ مہو نے رات کے سناٹے میں بلند ہوتے ہوئے قہقہے سے ڈر کے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"پاگل ہوئی ہے۔ میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں بھلا۔ میں اپنی جان پر کھیل کر تجھے یہاں سے نکالوں گا اور بھلا اپنی جان کون کسی کے حوالے کرتا ہے۔" اس کی محبت سے چور آواز دھیمی ہوئی۔

"مہو! تو تو میری جان ہے، تجھے چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میری سانس بند ہونے لگتی ہے جدائی کے خیال سے ہی۔"

اس کا ہاتھ دلدار کے دونوں ہاتھوں کے بیچ جکڑا ہوا تھا۔ اس نے دو، تین بار کوشش کی۔ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی۔ مگر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

اس نے گہری سانس بھری "تو میری عزت بنے گی۔ اور عزتوں پر مرد جان تو نثار کردیتے ہیں، مگر اس کو چھوڑتے نہیں۔"

"اللہ نہ کرے کہ تجھے کچھ ہو۔" وہ لرز اٹھی۔

وہ مسکرایا۔ "اس دل میں تو ہے مہو صرف تو۔" اس نے اس کا ہاتھ سینے پر دل کی جگہ رکھا۔

"دیکھ تیرے ہی نام سے دھڑک رہا ہے۔ غور سے سن۔"

مہو فوراً ایک جھٹکے سے اس سے دور ہوئی، اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"بس بس۔ آگیا یقین۔" وہ ہنسی۔

"چلے گی نا میرے ساتھ؟" اب اس کے لہجے میں یقین تھا۔ مگر وہ اس سے سننا چاہتا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں، تیرے ساتھ ہی جاؤں گی، اس

لیے کہ میری دھڑکن بھی صرف تیرا ہی نام لے رہی ہے۔" اس نے اقرار کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"جو جتنا ذہین ہوتا ہے وہ اتنی ہی اذیت سے گزرتا ہے۔ قدرت یونہی کسی کو کچھ نہیں دیتی۔"

لاڑکانہ جاتے ہوئے اس نے میہڑ کے ہوٹل پر چائے پیتے ہوئے کہا۔ "اور اگر درد مند دل ہو تو پھر اس زندگی کے ساتھ گزارا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "مگر وہ محبت کرنے والے ساتھ ہوں تو سہل بھی ہو جاتا ہے۔"

وہ سرمد کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔

"چلیں؟" سرمد نے بل دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ویسے میہڑ کی مہندی بڑی مشہور ہے کیا خیال ہے تمہارے لیے لے لی جائے؟"

"ہاں! میہڑ کی مہندی کو تو شادی بیاہ کے گیتوں میں بھی گایا جاتا ہے۔ مگر واپسی میں لیں گے آج اگر شاپنگ کرنے نکل گئے تو دیر ہو جائے گی۔" وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"پاکستان کا کوئی بھی حصہ سرداری و جاگیرداری نظام سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔" راستے میں ایک بہت بڑے وڈیرے کی زمینوں کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "کبھی کبھی دل کرتا ہے کہ روحِ قائد سے شکوہ کروں۔ کہ اک جنبشِ قلم کی ہی تو دیر تھی پاکستان کے اندر پھیلے ہوئے انگریز کے مکارانہ جاگیردارانہ سسٹم کو ختم کرنے کی۔ کاش! کہ یہاں بھی ہندوستان کی طرح ساری جاگیریں، جائیدادیں سرکاری تحویل میں لے لی جاتیں۔ تو آج ہماری قوم شاید اتنی پسماندہ نہ ہوتی۔"

وہ اس کی پُر تاسف آواز پر نرمی سے مسکرایا۔

"کیا کرتا بھلا وہ بیمار نحیف و نزار شخص، کس کس محاذ پر لڑتا۔ کیسے وہ ان حالات میں جاگیرداروں کو ناراض کرتا، جبکہ مسلم لیگ تو تھی ہی نوابین کی جماعت۔ جس کا صرف سربراہ نواب نہیں تھا، نہ سپاہ، نہ پیسہ،

صرف مسائل ہی مسائل، ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا قتل عام اور پاکستان کے اندر مہاجرین کی آبادکاری کے مسائل، کس کس چیز کو دیکھتا وہ اکیلا شخص جو کہتا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ ڈیڑھ سکے کے سوا، ایک مولانا محمد علی جوہر، آدھا بہادر یار جنگ، تمہیں اندازہ ہے کہ ہماری فوج کے پاس صرف 170 گاڑیاں تھیں۔ اور جو جنگی جہاز ہمارے حصے میں آئے، ان کے انجنوں میں چینی بھر کے دی گئی۔ ہمارے پائلٹوں نے وہ جہاز ریگستانوں میں اتار کر جان بچائی اور ان پائلٹس کو لینے کے لیے پاکستان سے خصوصی جہاز گیا تھا۔ اور ہمارے حصے کی رقم لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے انتقام میں ڈبو دی، اور ہندو کو کھلی چھوٹ دے دی کہ وہ ہمیں اپنے حصے سے محروم رکھ کر اس نوزائیدہ مملکت کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ تب ہی قائداعظمؒ نے کہا کہ پاکستان کے پہلے بجٹ نے دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ یار! میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان اسٹیٹ بینک کا قیام، مہاجرین کی آبادکاری اور بہت سارے اہم فیصلے اس بیمار، موت سے لڑتے شخص کی بہت بڑی کامیابیاں تھیں۔"

سرمد کے لہجے میں اس عظیم انسان کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

"ہاں آپ بالکل صحیح تجزیہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان ہر طرح کا بولڈ اسٹیپ لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس بھرا ہوا خزانہ، مضبوط فوج و بیورو کریسی اور انگریز کی شفقت تھی۔ مگر پاکستان کے وجود کو اس مضبوط جاگیردارانہ نظام میں جکڑے دیکھتی ہوں تو دکھ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کا انتظامی ڈھانچہ اور بیورو کریسی بالکل مفلوج ہے۔ ملک و عوام کی بھلائی سوچنا جیسے ان کے لیے گناہِ عظیم ہو۔"

دراصل ہمارے ہاں قائد کی وفات کے بعد لیاقت علی خان کو قتل کر کے جو غیر جمہوری قوتیں برسراقتدار آئیں۔ انہوں نے سارے نظام کا ستیاناس مار دیا۔ غلام محمد اور اسکندر مرزا دونوں جمہوریت کے دشمن

اول ہیں۔"

"آپ کی بات صحیح ہے سرمد! مگر میرے خیال میں جمہوریت کی ناکامی مسلم لیگ کی بطور سیاسی ادارے کے کمزوری اور جاگیرداروں کے مفاد سرفہرست ہیں۔ اگر وہ ایمان داری سے سیاسی عزم و استحکام کا مظاہرہ کرتی تو پاکستان کے اندر شاید جمہوریت کو یوں پٹڑی سے نہ اتارا جاتا۔"

"درحقیقت ہماری بدقسمتی ستمبر 1948ء کی اس گھڑی سے شروع ہوئی جب بانی پاکستان نے کھٹارا سی ایمبولینس میں آنکھیں موند لیں۔ صرف قائد نے ہی آنکھیں نہیں موندیں، قوم کی قسمت نے بھی آنکھیں موند لیں۔"

اس نے افسردگی سے کہہ کر گہری سانس لی۔ اور سرمد نے اک نظر بھر کر اس کو دیکھا۔ وہ اس کی صرف ہم کی ہم سفر نہیں تھی، کام کی بھی ہم سفر و ہم نوا تھی۔

"ان شاء اللہ اب قوم ان ساری استحصالی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوگی۔" اس نے پُر امید لہجے میں کہا۔ آٹھ گھنٹے کا طویل سفر طے کر کے وہ لاڑکانہ پہنچے تھے۔

☼ ☼ ☼

سب سے بڑا مسئلہ جو ان کو درپیش تھا وہ رہائش کا تھا۔ وہ اگر چھپتے بھی تو کہاں۔ اگر شمالی سندھ کے کسی ضلع میں تو شمالی سندھ کے سرداروں، وڈیروں کے ایک دوسرے سے گہرے روابط تھے۔ اگر روابط نہ بھی ہوتے تو بھی ان معاملات میں وہ فیصلے جرگے کے مطابق ہی کرتے۔ بلوچستان بھی نہیں جا سکتے تھے۔ وہاں کے سرداروں کی بھی رشتہ داریاں، برادریاں سندھ کے سرداروں سے بڑی مضبوط تھیں۔

کراچی جاتے تو بھی ان کو پکڑے جانے کا خوف تھا، سو ان کے لیے سب سے مضبوط انتخاب پنجاب تھا۔ شرف نے گھر، زمین اور دکان بیچ دی اور پیسے لے کر سارے انتظامات کرنے پنجاب چلا گیا۔ اس نے وہاں گھر خریدا، دکان لی۔ اور باقی پیسے بینک میں رکھوا کر

آ گیا۔ اب کی بار مال مویشی بھی بیچ دیے اور بیوی بچوں کو لے کر چلا گیا۔

گاؤں والوں کو اس نے بتایا تھا کہ کاروبار کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہے۔ دلدار کو بتا سمجھا دیا تھا۔ وہ رات کو دو بجے مہو کو نکل آنے کا کہہ کر دو دن پہلے ہی وہاں سے چلا گیا کہ فوری طور پر کسی کو اس پر شک نہ ہو سکے۔ اختیار سے اس نے لاڑ (جنوبی سندھ) سے بیل خرید کر لانے کا بہانہ کیا اور شہر آ کر ہوٹل میں رہنے لگا۔ اسے ڈر بھی بہت لگ رہا تھا۔ مگر وہ مہو کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

دلدار کو زندگی میں پہلی بار کسی عورت سے محبت ہوئی تھی۔ اور اب وہ جان پر کھیل کر بھی اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اور اب اس کے اور مہو کے وصل میں صرف ایک رات کا فاصلہ تھا۔

اشرف نے بہاول نگر میں اس کے نکاح کے مکمل انتظامات کر لیے تھے۔ اب صرف ان دونوں کے پہنچنے کی دیر تھی۔ پروگرام کے مطابق گاڑی کو وہ سکھر میں چھوڑ دیتے اور پھر سکھر سے ٹرین کے ذریعے بہاول نگر جاتے۔

☼ ☼ ☼

اس دن خنکی پتا نہیں کیوں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ مگر باوجود اس کے مہو کی پیشانی پسینے سے تر ہوئے جا رہی تھی۔ اس نے اپنی الماری کھولی اور جلدی سے زیور اور پیسے نکالے، فائزہ کے نہا کر آنے سے پہلے اس نے زیور اور کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کے لا کر لانڈھی میں اپنی چارپائی پر رکھی اور آٹا گوندھنے لگی۔

"آج کپڑے دھونے کا ارادہ ہے کیا؟" بھابی نے سالن میں ڈوئی چلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں کافی کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔" اس نے گٹھڑی کو دیکھا اور اپنے اندر کے چور پر گھبرا گئی۔

"آج جھڑ (ابر) ہے۔ سردی بھی زیادہ ہے۔"

"ہاں ہے تو سہی۔" اس نے بھاجائی کے تبصرے کا مختصر جواب دیا۔

"دلدار نہیں ہے تو گھر میں خاموشی چھائی ہوئی ہے۔" وہ ٹماٹر کاٹتے ہوئے بولی۔ "آکر بیٹھتا ہے تو دنیا جہان کی باتیں کرتا ہے۔ سارے گاؤں کی رپورٹ، سردار کے بنگلے پر کیا ہوتا ہے، سب بتاتا رہتا ہے۔"

وہ خاموشی سے روٹی پکاتی رہی۔ بھاجائی نے چپ سادھے مہو کو ایک نظر دیکھا۔ پھر ٹماٹر ہنڈیا میں ڈالے اور گوشت بھوننے لگی۔

"مہو! اک بات پوچھوں؟"

مہو کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ پتا نہیں کیا پوچھ لے۔

"جی۔ جی بھاجائی! پوچھو۔" اس نے گھبراہٹ پر قابو پاتے کہا۔

"کیا تم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہو؟"

"کک۔ کہ کون؟" وہ ہکلانے لگی۔

"تم اور دلدار۔" اس نے بغور اسے دیکھا۔

"نہیں بھاجائی! ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا، دیکھ نمک، مرچ ٹھیک ہے۔" اس نے پلیٹ میں تھوڑا سا شوربہ ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"ٹھیک ہے بھاجائی!" اس نے چکھ کر کہا۔

"تم دیکھنا سالن لگ نہ جائے۔ میں آتی ہوں پانچ منٹ میں۔" وہ تاکید کر کے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد اس نے کھل کر سانس لی، کیسے کٹے گا دن۔ کہیں پکڑی نہ جاؤں۔ یا اللہ خیریت سے نکل جاؤں۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

روٹیاں پکا کر وہ بستر میں آلیٹی۔

سب کی نظروں سے بچنے کا اک یہی واحد حل تھا۔ دل خوف سے کانپ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر سر منہ لپیٹے پڑی رہی۔

"مہو! کھانا کھالے۔" بھاجائی نے اس کا سالن پلیٹ میں نکالتے کہا۔

"نعمت خانے میں رکھ دیں۔ بعد میں کھالوں گی۔"

وہ بستر میں پڑی رہی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ شام کو اٹھ کر چائے بنائی اور کپ لے کر اپنے کمرے میں آگئی، جو اب خائنہ کا تھا۔

پتا نہیں کیوں اس کا دل بھر آیا۔ اک عجیب سی کیفیت اس پر چھا گئی۔ وہ اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اک سکوت سا وجود کے اندر در آیا۔

کیا وہ صحیح کر رہی ہے؟" اس نے خود سے پوچھا۔

"آج تک اختیار کون سے صحیح کام کرتا رہا ہے جو میں یہ سوچوں۔" اس کے دل میں نفرت کی شدید لہر ابھری تھی۔ "جہنم ہے یہ گھر اور اس کا ماحول، کیسے زندگی گزرے گی ایسے ماحول میں۔" اس نے بے دلی سے سوچا۔

دلدار نے مجھے ایک اچھی محبت بھری زندگی دینے کا وعدہ کیا ہے۔

"وہ میرے لیے اپنا گھر، وطن، سب کچھ چھوڑ رہا ہے۔ صرف میری خاطر۔" اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔

وہ بار بار سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتی۔ جہاں اب مغرب کا دھند پھیلتا جا رہا تھا۔ رات کا کھانا اس نے جلدی کھالیا اور سردی کا بہانہ کر کے سوگئی۔ جب آنکھ کھلی تو ایک بج رہا تھا۔ اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا۔ ارد گرد دیکھا تو سارے کمروں کے دروازے بند تھے اور باہر سناٹا گشت کر رہا تھا۔

"نہیں یہ بھی خیال نہیں کہ ہماری بہن اکیلی ہے۔ باہر سوئی ہے کوئی چور اچکا بھی آسکتا ہے۔ پہلے تو دلدار باہر سوتا تھا۔ لگتا تھا جیسے پہرہ ہو مگر اب تو وہ دن سے وہ بھی نہیں۔"

بے ساختہ اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نے گٹھڑی میں باندھے ہوئے چند جوڑے کپڑے اور زیور اٹھائے، وہ زیور جو اس کی ماں سے اس کے حصے میں آئے تھے۔ ایک الوداعی نظر اس گھر پر ڈالی اور آہستگی سے گیٹ کھول کر باہر نکل آئی۔

وہ جو سارا دن ڈرتی رہی تھی، اس وقت بڑی

بے خوف و نڈر تھی۔ وہ روڈ تک آگئی تھی۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ سامنے سے آتی گاڑی کی ہیڈلائٹس پر اس نے فوراً شال منہ پر لپیٹی۔ گاڑی اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ اور اس کے اندر بیٹھے دلدار نے دروازہ کھولا۔ وہ فوراً بیٹھ گئی۔

گاڑی گاؤں کے راستے سے واپس مڑ گئی۔

گاؤں کے کھیتوں پر گاڑی کی لائٹس پڑتی رہیں۔ اس کی آنکھ سے پہلی بار دو آنسو گر کر شال میں جذب ہوگئے۔ کاش! وہ لوگ مجھے دلدار کے ساتھ عزت سے رخصت کرتے۔ تو مجھے یہ قدم نہ اٹھانا پڑتا۔

مگر وہ تو غیر برادری کا سن کر مرنے مارنے پر تل جاتے۔ حالانکہ اسی غیر برادری کے شخص کو انہوں نے گھر کے اندر آزادانہ آنے جانے کی اجازت دے کر گھر کے فرد کی سی اہمیت دے رکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

سینا ہوٹل میں سندھ کے مسائل پر سندھ سجاگی کے تحت تین روزہ آگہی سیمینار کا آغاز ہوچکا تھا۔

پہلے دن دونوں سیشنز میں کارو کاری۔

دوسرے دن قبائلی جھگڑے۔

اور تیسرے دن، سرزمین سندھ میں امن و تصوف کا عروج، سندھی سماج میں محبت اور صوفیاء کی تعلیمات محبت کا اثر۔

اول حسین نے اپنی این جی او کے اغراض و مقاصد کو بیان کر کے سب مندوبین کا شکریہ ادا کیا اور ماروی کو ابتدائی کلمات کہنے کے لیے بلایا۔

سوسی کی شلوار پر، سندھی کڑھائی والی قمیص پر سیون دھچری میں اس کا سراپا دمک رہا تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ مہمانوں پر ڈالتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا۔

"میں اپنی بات کا آغاز سونہاری (حسین) سندھ کے گیارہویں صدی ہجری کے سیاح محمد رضائی سندھی کی لکھی ہوئی مثنوی سسی پنوں کے اس دیباچے سے کروں گی جس میں انہوں نے سندھ کے سونہہ (حسن) اور عاشق مزاجی کی تصویر کھینچی ہے۔

سندھ میں جگہ جگہ عشق کی کہانی ہے۔ اس ملک کی آب و ہوا عشق سے پُر ہے۔ سندھ کا ہر ویرانہ عشق سے آباد ہے، ہر ایک شخص کو دوست کا سودا لاحق ہے اور ہر شخص عشق کے نشے میں مست نظر آتا ہے۔ سندھ کے لوگوں کو چھوڑیے، یہاں کے تو پرندے بھی عشق میں اتنے دیوانے ہیں کہ پروانہ و بلبل کے حریف بننا چاہتے ہیں۔ سندھ عشق کا مسکن اس لیے ہے کہ اس میں ہر طرف حسن ہی حسن ہے۔ سندھ جیسا خوبصورت ملک دنیا میں کہیں نہیں۔ یہاں جو آیا، یہیں کا ہوگیا۔ یہاں جس طرف بھی نظر کیجیے تو ماہ و مہر جیسے دل موہ لینے والے انسان نظر آتے ہیں۔ اوروں کو تو چھوڑیے، سندھ کا نوزائیدہ بھی ناز و نخرے سے خالی نہیں ہے۔"

سرمد کو یاد آیا اس نے ایک بار ماروی سے کہا تھا۔

"مجھے خوبصورت چہرے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"اور خوبصورت دل؟" اس نے پُراشتیاق نگاہیں سرمد پر جمائی تھیں۔

"خوبصورت چہروں کے ساتھ خوبصورت دل نہ ہو تو ان چہروں کی خوبصورتی کا سحر بہت جلد اتر جاتا ہے۔"

آج وہ اس خوبصورت چہرے اور خوبصورت دل والی کو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس سندھ کا تصور تھا جو محبت کے پھولوں سے مہک رہا تھا۔ جہاں کارو کاری جیسی قبیح رسمیں نہیں تھیں۔

"مگر میں پوچھتی ہوں وہ کون سے نادیدہ ہاتھ تھے جنہوں نے سندھ کے شہروں کو دہشت گردوں کے دامن میں ڈال دیا۔ دیہاتوں کو ڈاکوؤں کے ڈیرے بنا دیا۔ تعلیمی اداروں کو غنڈوں کے ہاتھوں غرق کیا۔ بڑی مونچھوں والے وڈیرے، بڑے پیٹوں والے افسران، نادیدہ ہاتھوں کے اشاروں پر کھیل کھیلتے رہے۔ اور بہت سارے معصوم انسان اپنی زندگی ہار گئے۔"

اس نے اپنی تقریر کا اختتام کیا تو ہال بہت دیر تک تالیوں کے شور سے گونجتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ولدار حسین اسے بھا اشرف کے پاس لے آیا تھا۔ بھا اشرف نے ولدار کو فی الحال باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ سارا سودا سلف خود لاتا تھا۔ اس کا بھی بے حد خیال رکھتا تھا۔ باہر جانے سے پہلے اس سے پوچھتا۔

"بھابھی! تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" اور وہ ہنس کر کہتی کہ "بھا! کل ہی تو آپ یہ چیزیں لائے تھے۔ اتنی جلدی ختم تھوڑی ہو گئیں۔"

وہ بھاول نگر میں بھینسوں کا باڑہ بنا کر دودھ بیچ رہا تھا۔ باقی پیسے اس نے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے تھے۔ وہاں سے اسے ماہانہ بیس ہزار کا منافع مل رہا تھا۔ ان کا وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ صرف ڈر تھا کہ کہیں ان لوگوں کو ان کا پتا نہ چل جائے۔ اشرف کا سیل فون پر اپنے اک دوست سے رابطہ تھا۔ وہ ہفتہ دس دن میں فون کر کے اپنے پیچھے ہونے والی ساری روئیداد اس سے پوچھتا۔ اور پھر سم نکال کر دوسری ڈال دیتا۔ اشرف کے دوست نے بتایا تھا کہ پورے سندھ میں سردار کے لوگ پھیل گئے ہیں اور سردار نے کہا ہے یہ میری عزت کا معاملہ ہے کہ میرے کمدار کی بہن بھاگ گئی ہے۔ میں اس کو ہر قیمت پر ڈھونڈ نکالوں گا۔ سارے سندھ کے اور بلوچستان کے وڈیرے اور سرداروں سے اس نے رابطے کیے ہیں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اشرف اور ولدار کو ڈھونڈیں' وہ یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی' لیکن اشرف اور ولدار نے اسے تسلی دی تھی۔

"تم دل چھوٹا مت کرو' سردار کبھی بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر پہنچ بھی گیا تو ہم کبھی بھی تمہیں اس کے حوالے نہیں کریں گے۔ کہیں دور جگہ ٹھکانہ بنائیں گے۔ اور اس کے لیے انہوں نے ایک گھر ملتان میں بھی لے لیا تھا۔

گھر میں سارا دن بھا اشرف کی بیٹیاں اسے چاچی چاچی کہہ کر اس کے آگے پیچھے پھرا کرتیں۔ اشرف کی بیوی اسے کام میں ہاتھ ڈالنے نہ دیتی۔

"تو بس ولدار کے پاس جا کر بیٹھ۔ کام میں خود کر لوں گی۔ پتا ہے ولدار تم سے بڑی محبت کرتا ہے۔ جب بھی گاؤں آتا تو مجھے تمہارے ہی قصے سنایا کرتا تھا۔"

اور وہ مسکرا دیتی' اب ولدار کی چاہت پر اس کو پکا یقین آگیا تھا۔ اس کی محبت پا کر وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

"پتا ہے مسو! میں سوچتا تھا کب وہ دن میری زندگی میں آئے گا جب تو میری بنے گی۔"

وہ اس کی لمبی چوٹی سے کھیلتا رہتا۔ اس کے پراندے سے خود کو پنکھا جھلتا رہتا۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ پریشان کن خبروں کے باوجود بھی بات بے بات ہنسی اس کے وجود سے پھوٹ کر نکلتی۔ تب وہ سوچتی شاید یہ سب محبت کی کرامت ہے۔ محبت جس نے اس کو جینا سکھایا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیمینار کے تیسرے دن پہلے سیشن میں انہوں نے مندوبین کو لاڑکانہ شہر سے پچیس میل دور موہن جودڑو گھمانے کا پروگرام بنایا تھا۔

ڈھائی سو ایکڑ پر پھیلا موہن جودڑو جس کی کنسٹرکشن اتنی پرفیکٹ ہے کہ جنہوں نے اس کی کھدائی کرائی' وہ خود بھی حیران رہ گئے۔ وہ دونوں چلتے ہوئے سٹرفورٹ کے اس وڑے تک آئے۔

"کیا ہمیں اوپر جانا چاہیے؟" ماروی نے اس سے پوچھا۔

"نہیں یار! میرے خیال سے اس قدیم تہذیب کو یوں ہی دور سے دیکھنا چاہیے۔ ان کو روندنے سے گریز کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ پانچ ہزار سال پہلے کے کھنڈرات ہیں اور اب یہ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بکھر رہے ہیں۔"

"ہاں جب منچلے نوجوان آتے ہیں تو موٹر سائیکل دوڑاتے جاتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ اپنی چند گھنٹوں کی تفریح کے لیے ہزاروں سال پرانی تہذیب کو اپنے ہی ہاتھوں مسمار کر رہے ہیں۔"

"تم صحیح کہتی ہو' انہیں پتا ہی نہیں کہ تہذیب و تاریخ قوموں کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکومت کا کام ہے۔ وہ سیکورٹی کا بہترین بندوبست کرے' اور موٹر سائیکل کا اندر داخلہ بند کروے۔ یہ حکومت کی نااہلی ہے کہ یہاں کے میوزیم سے قدیم نوادرات بھی چوری ہو گئے ہیں۔ میں نے اس پر پورا فیچر لکھا تھا۔ مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔" وہ پرتاسف لہجے میں گویا ہوا۔

"چلو تمہیں میوزیم دکھاتا ہوں۔" وہ اس کو ہاتھ سے پکڑے اندر آیا۔

"زیور اور بناؤ سنگھار عورت کی ازلی کمزوری ہے۔"

وہ مختلف پتھروں اور دھاتوں سے بنے زیورات دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"جب یہاں سے سونے کے زیورات ملے تو سرجان مارشل نے اسٹرینڈ لندن نیوز میں لکھا تھا۔ "سونے کے زیورات اتنے عمدہ طریقے سے بنائے گئے ہیں اور ان کی پالش اتنی شاندار ہے کہ جیسے ابھی ابھی لندن کی بانڈ اسٹریٹ سے بن کے آئے ہیں۔ پانچ ہزار سال پرانے تو لگتے نہیں۔" وہ میوزیم سے نکل کر کھلی فضا میں آگئے اور اک خوابناک سی کیفیت میں وہ ان گلیوں سے گزرتے رہے۔

"1922ء کا وہ دن جب بنرجی نے اپنے پاؤں سے موہن جودڑو کی مٹی کو کریدا اور وہاں سے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑوں نے انہیں چونکا دیا تھا۔ پھر موسم سرما میں بڑی مزدوروں کو لا کر انہوں نے کھدائی شروع کرا دی اور ایک عظیم تہذیب نے تاریخ کے صفحوں سے خود کو ظاہر کر دیا۔"

وہ اک مین ہول کے پاس رک گئی۔

"سرمد بریلس فورڈ نے لکھا ہے ایسا پرفیکٹ ڈرینج سسٹم یورپ میں انیسوی صدی میں نہیں تھا۔" سرمد مسکرا دیا۔

"ہاں' کتنی حیرت کی بات ہے کہ جب انسان کو تن ڈھانپنے کا بھی ہنر نہیں آیا تھا' سندھی سماج کے لوگ کس قدر تہذیب یافتہ تھے۔"

"یہی دیکھ کر تو میں حیران ہو رہی ہوں کہ یہ میونسپلٹی کا نظام آج بھی قابل تقلید ہے۔"

"ہم موہن جودڑو اور ہڑپہ کے لوگ ایک قدیم تہذیب کے وارث ہیں۔ یہ تہذیب جہاں عام آدمی یا عوام خوشحال تھے۔ یہاں کے کشادہ روشن ہوادار گھر اور ہر گھر میں کنویں کی صورت پانی کا سسٹم' غسل خانوں کا فرش بنا ہوا' بہترین ڈرینج سسٹم' ہر گھر کے باہر زیر زمین ڈسٹ بن' کشادہ گلیاں اور سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں کے لوگ پھٹی سے ململ بناتے تھے۔ گندم' جو' کھجور' مچھلی اور گائے کا گوشت کھاتے تھے۔ سارے انڈس ویلی کے لوگ خوشحال زندگی بسر کرتے' جبکہ مصر' میسو پوٹیمیا ایران کی تہذیبوں میں یہ آسائشات و محلات منارے صرف راجاؤں اور بادشاہوں کے لیے مخصوص تھے۔"

"میں آج بھی اپنے عوام کے لیے ایسی خوشحالی چاہتا ہوں۔ ہمارے بچے صرف دو وقت روٹی ہی نہ کھائیں' مگر بہتر تعلیم و تربیت سے بھی مزین ہوں۔ ان کے کھیلنے کے لیے کھلونے بھی ہوں۔ جیسے موہن جودڑو کے بچوں کو میسر تھے۔"

اس کے اندر دھواں بھر گیا۔ وہ کیسی تہذیب کے وارث ہیں۔ اور آج اکیسویں صدی میں جاگیرداروں کے گرداب میں پھنسی ان کی قوم کیسی پست زندگی گزار رہی ہے۔

سیمینار کے آخری سیشن میں اس کے اندر کا دھواں شعلہ بن گیا۔

"اس سماج کے اندر یہ پاکستانی قوم کس سے انصاف طلب کرے۔ قانون تو ان جرگائی سرداروں بااثر بھوتاروں اور وحشی وڈیروں کے گھر کی لونڈی ہے۔ ان کے لیے تو صرف وہ قانون ہے جو ان کے صدیوں پر محیط بدبودار غلیظ و مردار روایتوں اور جاگیردارانہ سوچ سے وجود میں آیا ہے۔ جو ان کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ ریاستی مشنری پاکستان کے قانون کی بالادستی کے لیے پریشان نہیں ہوتی' بلکہ سرداری نظام کو تقویت دینے کے لیے کام کرتی رہی ہے۔"

سینا۔ ہوٹل کا وی آئی پی ہال اس کی آواز سے گونج

رہا تھا۔ اس نے کھلے عام سرداروں کو للکارا۔

"عزیزانِ من! ہمارے ہاں جرگہ نظام میں ہر جرم کے فیصلے میں جرمانہ عورت ہی کیوں بھرتی ہے؟ کارو کاری ہو' یا تیزاب ڈالنا یا کوڑے مارنا۔ عورت کی زندگی و موت کے فیصلے اب سرداروں کے ہاتھ سے نکلنے چاہئیں' اور یہ ذمہ داری ریاست کو اٹھانا پڑے گی۔"

سارا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کا سارا لہو سمٹ آیا۔

"کارو کاری کی آڑ میں زمینوں کے قبضے' ذاتی دشمنی' قبائلی جھگڑے' جائیداد کے معاملات نمٹائے جاتے ہیں۔ یہ جبر ہے' ظلم ہے' یہاں قصاص و دیت کی چھوٹ قانون میں ختم کرنا پڑے گی۔"

اور یہ ساری شعلہ بیانی سردار کے کارندے ریکارڈ کر رہے تھے۔

✲ ✲ ✲

سردار خان محمد طیش کے عالم میں اپنے بنگلے کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔

"وہ میرے باپ کے نوکر کا پوتا' اس کی یہ جرأت کہ ڈائس پر کھڑے ہو کر مجھے للکارتا ہے۔ ہمارے کمی کمین اب ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے لگے ہیں۔ ہمارے نظام سے اور فیصلوں سے ٹکرانے لگے ہیں۔"

"سردار سائیں! اس کی یہ ہمت کہ ہمارے سردار سائیں کو برا بھلا کہے' آپ حکم کریں' ہم اس کی زبان کاٹ کر کتوں کے آگے ڈال دیں۔" سردار کے باڈی گارڈ نے گن کے دستے پر غصے سے ہاتھ مارا۔

"وہ بے غیرت ہے سردار سائیں! تعلیم نے اسے بے غیرت بنا دیا ہے۔ ورنہ مہو صرف میری بہن نہیں اس کی بھی منگ ہے۔" فدا حسین نے ہاتھ جوڑے۔

"ہم تو آپ کے غلام ہیں سائیں! آپ کا دیا ہوا رزق کھاتے ہیں۔ بڑے سردار نے کہا تھا' دھنی بخش سے کہ احمد علی کو مت پڑھا۔ اس نے لاچاری ظاہر کر دی کہ بیٹا باغی ہو گیا ہے۔ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ مگر آج اس احمد علی کا بیٹا ہمارے مقابلے پر آ رہا ہے۔"

اس نے سینے پر طیش سے ہاتھ مارا۔

"ہمارے مقابلے پر جس کی مدد سے انگریز نے یہاں پر حکومت کی' ارے' جس کے ساتھ ہم ہوتے ہیں' حکومت بھی اسی کی ہوتی ہے۔ اب یہ دو ٹکے کا چھورا' چار حرف کیا پڑھ لیے کہتا ہے سرداروں سے فیصلے کا اختیار چھینو' جرگوں کو غیر قانونی قرار دو۔"

سردار خان محمد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سرمد اگر سامنے ہو تو وہ اس کی بوٹی بوٹی کر لے۔

"سردار سائیں! آپ سے ٹکرائے گا تو پاش پاش ہو جائے گا۔" اختیار حسین نے اس کی خوشامد کی۔

وہ مختلف سرداروں' اور وڈیروں سے بات کرنے لگا' جو جرگے میں آئے تھے۔

کسی نے کہا سرمد پر مقدمہ دائر کر دو۔ کسی نے سرمد کا منہ پیسے سے بند کرنے کی تجویز دی۔ کسی نے اس کی زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کا کہا۔ اس کے اندر ایک گونہ اطمینان اتر آیا۔ سارے سردار اس کے ساتھ تھے۔ کیا کرے گا' بھونکتا ہے تو بھونکتا رہے۔ وہ ہنسنے لگا' اس نے باڈی گارڈ سے بندوق لی۔ جامن کے درخت پر بیٹھے تیتر کا نشانہ باندھا' وہ تڑپ کر گرا۔

"ہاں یہ نبھاگا (بدنصیب) کیا کر سکتا ہے بھلا۔ بھونکے گا تو شکار کر لیں گے' بڑا آیا ہمارے خلاف قراردادیں منظور کرانے والا۔" وہ اپنی پجارو میں بیٹھ کر 85 ایکڑ پر پھیلی مصنوعی جھیل پر آ گیا' جو اس نے اپنے فارم ہاؤس کے دو اطراف میں بنوائی تھی۔ یہاں بوٹ میں بیٹھ کر مچھلی کا شکار کرتا تھا۔

اسی فارم ہاؤس پر جرنیل و بریگیڈیئر' پولیس کے اعلا افسران' ڈی سی او' سردار اور اس کے عرب دوست آتے رہتے۔ ہرن اور تلور کا شکار کھیلا جاتا۔ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ شراب و شباب رات کے حسن پر اپنا آپ نچھاور کرتے' اور سرداروں کی

سرداری کے لیے خیر کے نعرے بلند ہوتے۔ قوم و وطن سے غداری کے صلے میں انگریز سرکار نے ان کے آباؤ اجداد کو سارے علاقوں اور جاگیرداروں کا مالک بنا دیا تھا۔ ان سب کی ایک جیسی زندگی اور ایک جیسے مشاغل تھے۔

ان کی جاگیروں میں ایوب کی زرعی اصلاحات کے نتیجے میں معمولی کمی ضرور ہوئی۔ مگر ختم نہیں ہوئیں' کیونکہ انہوں نے خاندان کے ہر فرد کو ہزار ہزار ایکڑ کا مالک بنا دیا تھا۔ اور اپنے نوکروں' کمداروں کے نام زمینیں ٹرانسفر کرا کے اپنی جاگیریں بچائی تھیں اور اب بھی سردار خان محمد کے خاندان کے پاس پچاس ہزار ایکڑ سے زائد جاگیر تھی۔ جو کہ صرف کاغذات پر دوسروں کو منتقل ہوئی تھی۔ مگر اس کے مالکان اب بھی وہی تھے' جو پہلے تھے۔

✲ ✲ ✲

وہ سیمینار کے کامیاب انعقاد کے بعد گاؤں آ رہے تھے کہ زیب النساء کا پیغام ملا تھا' اس نے سردار کے غیض و غضب کے بارے میں بتاتے ہوئے انہیں گاؤں آنے سے منع کیا تھا۔

سرمد نے گاڑی جانب علی شاہ کے گاؤں کی طرف موڑ دی۔ وہ دربار میں پہنچے تو شام کا پنچھی اڑنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جانب علی شاہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے فقیر خادم حسین کو بتایا کہ سائیں سے ملاقات کی غرض سے آیا ہوں۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"سائیں! آپ نے مجھے کہا تھا جیتنے سے پہلے ہارنا ضروری ہوتا ہے۔ ہار کے بغیر جیت نہیں ہو سکتی۔ سالک محبت مرد ہو یا عورت پہلے محبوب کے آگے خود کو ہار دے۔ پھر تاج فتح پہن سکو گے۔"

"مجھے یاد ہے سرمد اور تم نے کہا تھا محبت برابری کا معاملہ ہے' لو اور دو۔"

"ہاں سائیں! میں نے یہ کہیں پڑھا تھا۔"

"اور میں نے کہا تھا۔ عشق تو صرف دین ہی دین کا معاملہ ہے صرف دینا پڑتا ہے' لینے کی امید کے بغیر۔ تو دعوے دار عشق ہے نا؟"

جانب علی شاہ کے باریک مونچھوں تلے گلابی لب مسکائے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے سائیں! کہ آپ کے اس نکتے کے سامنے میری ساری دلیلیں' منطقیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں' میں خود کو ہار گیا۔ اور آج اپنی جیت کے ساتھ آپ کی زیارت کرنے آیا ہوں۔"

اس نے ماروی کی طرف دیکھا۔

"ہاں بابا! عشق ایک بحر ہے' لطیف شاہ نے فرمایا عشق بحر دی خبر نہ کالی رنگی رنگ بنایا۔"

کڑ لے کھیس میں لپٹے سائیں جانب علی شاہ کی نظریں اپنے گھٹنوں پر جم گئیں۔ کسی غیر مرئی نقطے پر اور سائیں کا جسم آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔

"کوئی اس بحر کے کنارے پر ہی گزارہ جاتا ہے۔ کوئی اس بحر میں چند ڈبکیاں لگا کر نکل آتا ہے۔ اور کوئی اپنی کشتی ڈالتا ہے تو کچھ آگے چل کر دوسرے کنارے تک نہ پہنچنے کی مایوسی کے ساتھ لوٹتا ہے۔ سب یہ سمجھتے ہیں ہم نے عشق کو پا لیا۔ مگر اس سمندر کا دوسرا کنارہ نہیں ہوتا۔ اپنی کشتی بحر میں ڈال کر موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو' یہاں تک کہ عمر تمام ہو جائے۔"

"سائیں! کیا کسی کو بھی دوسرا کنارہ نہیں ملتا۔" ماروی نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہاں ملتا بھی ہے بابا! جب عمر تمام ہوتی ہے' تب عشق کا دوسرا کنارہ ملتا ہے' اور وصل نصیب ہوتا ہے۔"

ان کے کھڑے گھٹنوں کے گرد لپٹے ہوئے بازوؤں پر سر جھکتا چلا گیا' وہ عشق کی گہرائی میں کھو گئے۔ ان کا عشق بھی اعلا تھا اور ان کا وصل بھی۔

اس لمحے وہ تین نفوس اس سکوت میں اپنی سانسوں کی آواز بخوبی سن رہے تھے۔

"سائیں! ہمیں اب اجازت۔" سرمد آہستگی سے گویا ہوا۔

سائیں کے گھٹنوں پر لپٹا ہوا بازو اوپر اٹھا اور دایاں

ہاتھ اس کے سر پر آٹھہرا۔

"ہجر عشق کا سنگھار ہے۔" وہ دونوں سن سے بیٹھے رہ گئے۔ سائیں کا بازو اپنے گھٹنوں کے گرد پھر لپٹ گیا۔ وہ پھر اردگرد کے ماحول سے بیگانہ ہو گئے۔

"اٹھو ماروی!" سرمد سکتے کی سی کیفیت سے باہر نکلا۔ ماروی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ "سائیں نے یہ کیوں کہا ہجر عشق کا سنگھار ہے؟"

چپل پہنتے ہوئے اس نے اپنے جسم میں لرزش سی محسوس کی۔ سرمد نے غیر محسوس طور پر اسے سہارا دیا۔

فقیر خادم حسین اندر آگیا۔

جب سرمد نے مین روڈ سے گاڑی اول حسین کے گاؤں کی طرف موڑی تو اک گولی گاڑی کا شیشہ چیر کر ان دونوں کے درمیان سے گزر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"دلدار! دل چاہتا ہے کہ وقت یہیں ٹھہر جائے۔" مہو کے لہجے میں حسرت سی تھی۔

"وقت کتنا بھی گزر جائے' ہماری محبت اسی طرح رہے گی۔" دلدار حسین نے کہا تو مہو کی آنکھوں میں محبت کے ٹمٹماتے دیوں کی لو اور روشن ہو گئی۔ اس نے الماری سے دلدار کا استری کیا ہوا سوٹ نکال کر واش روم میں رکھا۔

وہ نہانے چلا گیا اور مہو کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اس نے بیڈ شیٹ تبدیل کر کے جھاڑ پونچھ کی۔ جھاڑو دے کر پوچھا لگایا اور ناشتہ بنانے کے لیے کچن میں گھس گئی۔ وہ کام پھرتی سے کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک کام سے فارغ ہوتی تو اس کے بھائی بھابھیاں "فوراً" دوسرا کام اس کو دے دیتے۔ نتیجتاً گھر کی ساری ذمہ داریاں اسی پر آ گئی تھیں۔

یہاں شروع شروع میں تو اسے کام کرنے نہیں دیا گیا مگر جب دلدار باڑے پر جانے لگا تو وہ بیٹھ بیٹھ کر بور ہو جاتی۔ اسے کام کرنے کی عادت تھی' آہستہ آہستہ اس نے کام شروع کر دیا تھا۔ اب پہلے کمرے کی صفائی کرتی' دلدار کے لیے ناشتہ بناتی اور وہ چلا جاتا تو دوپہر کی روٹیاں پکانے کے بعد وہ سارا دن فارغ ہوتی۔ وہ ناشتے کے لیے روٹیاں پکا کر انڈے تل رہی تھی کہ دلدار کچن میں گھسا۔

"ناشتہ تیار ہے؟" وہ مسکرا کر گویا ہوا۔

"ہاں' بالکل تیار ہے۔" اس نے کچن کے باہر بنے لاؤنج میں ٹیبل پر ٹرے لا کر رکھی۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا' اس کی پشت پر لہراتی لمبی چوٹی کو پکڑ کر شرارت سے جھٹکا دیا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دلدار کو دیکھا۔ دونوں مسکرائے۔ بہت گہری' آسودہ سانس لے کر دلدار کے لیے کرسی نکالی۔

"صبح ہو گئی چاچی؟" دلدار کی بھتیجی عائشہ نے شرارت سے کہا۔

دلدار نے بھتیجی کے سر پر چپت رسید کی' مہو مسکرا دی۔ وہ ناشتہ کرنے لگے۔

"دلدار...!" اشرف پریشانی سے اندر داخل ہوا۔

"جی ادا...!"

"تم باہر نکلنا بند کر دو' ابھی ابھی مجھے فون پر پتا لگا ہے کہ سردار نے جرگہ بلایا ہے' جس میں سارے سرداروں نے شرکت کی۔ ہماری برادری کا سردار بھی گیا تھا۔"

دلدار کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے پلیٹ پرے کھسکا دی۔ مہو پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔

"سردار خان محمد نے کہا ہے کہ میرے کمدار کی بہن کو دلدار نے بھگانے کی جرأت کیسے کی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اپنے کمدار کی عزت نہیں بچا سکا تو قبیلے والوں کی کیا بچائے گا۔ سردار اتنا بے حمیت ہے کہ وہ ایک بانہہ (بھاگی ہوئی عورت کا بازو) واپس نہیں کر سکا۔ اب یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔"

"دا اچھا...؟" دلدار پریشان ہو گیا۔

"جرگے میں یہ ذمہ داری ہمارے سردار کو دی گئی ہے کہ وہ مہو کو واپس کرائے ورنہ ہمارے قبیلے کی لڑکیوں کو اغوا کر لیا جائے گا۔ ہمارا پورا قبیلہ ہمیں

ڈھونڈنے کے لیے سرگرم ہو گیا ہے۔"

"دلدار! میں مرنا نہیں چاہتی' میں تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔" مہو کی آنکھوں میں سیلاب اتر آیا۔

"تم پریشان نہ ہو مہو! ہم مرد ہیں۔ پریشانیاں ہمارے لیے چھوڑ دو۔" دلدار نے اسے دلاسا دیا۔

"ہاں ہاں' بھئی ہم مرد ہیں۔ خود ہی حالات سے لڑیں گے۔"

اشرف نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اسے کچھ ڈھارس ضرور ہوئی مگر اندر ہی اندر خوف نے جڑ پکڑ لی۔ دلدار سے بچھڑنے کا خوف بار بار اس کی زبان پر آتا رہا۔

"تم کیا سمجھتی ہو' میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں۔ میں بھی مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا کر یقین دلاتا تو زندگی پر یقین سی ہو جاتی۔

وہ دلدار کی اور دلدار اس کا اور ان دونوں کی محبت تھی۔ محبت جو ٹکرانے اور لڑنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

☼ ☼ ☼

گولی اس کے بائیں بازو پر لگی تھی۔

وہ گاڑی اول حسین کے گاؤں کے راستے پر ڈال چکا تھا اور اول کو فون پر آنے کا بتا بھی دیا تھا۔ اول نے گاؤں کے لوگوں سے کہہ دیا تھا' الرٹ تھے' اس لیے انہوں نے فائرنگ کی آواز سن کر ہوائی فائرنگ کی۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے سردار کے لوگ فائرنگ سن کر بھاگ گئے۔ اس نے گاڑی سائیڈ پر کھڑی کر دی۔

ماروی نے موبائل کی روشنی میں اس کے بازو سے بہتا ہوا خون دیکھا۔

"سرمد...!" وہ تڑپ اٹھی۔ دل کے قطرے آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے۔

ماروی کے آنسوؤں کو دل کی شدت سے محسوس کر کے اس نے درد کو ضبط کیا۔ اور دایاں ہاتھ بائیں بازو سے ہٹا کر اس کے چہرے کو تھپتھپایا۔

فون کی بیل بجی۔

"کیا ہوا' فائرنگ کی آواز کیسی ہے؟ تم لوگ کہاں تک پہنچے؟" اول نے ایک ہی سانس میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"اول! سرمد کو گولی لگی ہے۔" وہ ایک بار پھر رو دی۔

"کیا کہا... وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں۔" سسکی ان کے لبوں سے نکلی تھی۔

"تم پریشان نہ ہو' ہم پہنچ رہے ہیں۔" اول نے فون بند کر دیا۔

اول آندھی کی طرح پہنچا تھا' اس کے ساتھ دو ہتھیار بند بھی تھے۔ اس نے سرمد کو سہارا دے کر گاڑی سے باہر نکالا اور اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ماروی بھی اس کے پیچھے آ بیٹھی۔ اول نے ایک گارڈ کو سرمد کی گاڑی لانے کو کہا۔

وہ چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاؤں پہنچ گئے۔ سارا نے پہلے ہی گاؤں کے ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔

"کوئی پریشانی کی تو بات نہیں ڈاکٹر صاحب!"

"میرے خیال سے گولی بازو کو چھو کر نکل گئی ہے۔ میں بینڈیج کر دیتا ہوں۔ دو پین کلر دے دیں۔ درد میں یقیناً فرق پڑے گا۔"

اول حسین' ڈاکٹر کو باہر تک چھوڑنے گیا۔ وہ اس سارے عمل میں دل تھام کر بیٹھی رہی۔ اسے لگتا کہ رہ رہ کر اس کے دل سے درد کی لہر اٹھتی ہے جو سارے جسم کو شل کر دیتی ہے۔

"کاش! یہ گولی مجھے لگتی۔"

"پاگل گولیاں کھانا مردوں کا کام ہے' عورتوں کا نہیں۔"

"بہت درد ہو رہا ہے نا؟"

"نہیں' مزا آ رہا ہے۔" وہ اس کے روہانسے چہرے کو دیکھ کر شرارت سے ہنسا۔

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے' مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری جان نکل رہی ہو۔"

"تمہارے سامنے بیٹھا ہوں پھر بھی...؟"

"تب ہی تو رکی ہوئی ہے۔" ماروی کے بے ساختہ

کہنے پر دونوں ہنس دیے۔

"سردی لگ رہی ہوگی' صرف بنیان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس نے اپنی شال اس کے کاندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی۔ تم تو بیوی کے رنگ میں رنگ گئے ہو۔" اول نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لیڈیز شال اوڑھے سرمد پر چوٹ کی۔

"بس اول یار! کیا کروں' سب آپ کی صحبت کا فیض ہے۔"

دودھ گرم کر کے لانے والی سارا شوہر کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تم لوگ اب بے فکر ہو کر ریسٹ کرو' میں نے پہرہ بٹھا دیا ہے اور اختیار سے بات کر کے اس کو دھمکی دی ہے کہ اگر سرمد کو کچھ ہوا تو میں تمہیں سردار سمیت قتل کر دوں گا۔"

"یار اول! ہم تو آپ کو شریف آدمی سمجھتے تھے۔" سرمد ہنسا۔

"ہوں تو شریف آدمی مگر بدمعاشوں سے ان کی زبان میں بات کرنا پڑتی ہے۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"تم کھانا کھا لو۔" سارا نے ماروی سے کہا۔

"نہیں ادی! بھوک مر گئی ہے۔"

"چلو سرمد کے ساتھ دودھ پی لو اور سنو' اپنا منہ دھو لو۔" اس نے یہ جملہ بہت رازداری سے کہا۔

"کیا ہوا ہے میرے منہ کو؟"

سارا اور سرمد بے ساختہ ہنس دیے

اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا۔ سرمد کی خون آلودہ انگلیاں اس کے چہرے پر ثبت تھیں۔ وہ مسکرا کر واش روم میں گھس گئی۔

سرمد نے اپنے اخبار کے ایڈیٹر کو فون کر کے حملہ کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔

پریشان کن شام کے بعد پرسکون رات پھیلتی جا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

دلدار کی برادری کے سارے لوگ ان کو ڈھونڈنے میں سرگرم ہو گئے تھے۔ جرگے کے فیصلے پر ان کو ہر طرح عمل کرنا تھا۔ سرداروں کا دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ دلدار کے قبیلے کے وہ لوگ جو شہروں میں ایک یا دو گھروں کی صورت رہتے تھے۔

انہوں نے اپنی فیملیز کو کہیں اور منتقل کر دیا جو لوگ گاؤں میں تھے انہوں نے پہرے بٹھا دیے۔

چند دن سے اسے بخار تھا مگر اب متلی بھی ہونے لگی۔ اشرف اور اس کی بیوی اسے ڈاکٹر کے کلینک لے کر آئے۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد اس کو اپنے ہی کلینک میں بیٹھی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ خوش خبری ہے۔ یہ امید سے ہیں۔" ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا کر ان کو دیکھا۔

"سچ ڈاکٹر صاحبہ! ہم تو پریشان ہو گئے تھے۔"

"بس ان کی غذا کا خیال رکھیں۔ دودھ فروٹ اور جوسز کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرائیں۔" ڈاکٹر نے ہدایت کی۔

اس نے باہر آ کر اشرف کو بتایا۔ واپس آتے ہوئے راستے میں انہوں نے مٹھائی لی۔

وہ پہنچے تو دلدار بے تابی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"منہ کھول۔" اشرف نے فوراً گلاب جامن اس کے منہ میں رکھی۔

"میرا بھائی' باپ بننے والا ہے۔" اس نے دلدار کو گلے لگا لیا۔

"بس آج سے کام بند چاچی! میں صفائی کروں گی کمرے کی۔" اشرف کی بڑی بیٹی نے جوش سے کہا۔

"اور میں ناشتہ بنا دوں گی۔" دوسرے نمبر والی چلائی۔

وہ تھوڑی سی گھبرائی شرمائی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"یہ ہمارے پیار کی نشانی ہے۔ ہم اسے بہت محبت سے پالیں گے۔" دلدار مسکراتا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔

"ہم اس کا نام کیا رکھیں گے؟" وہ پُرسوچ انداز میں

گویا ہوا۔

"پتا نہیں۔"

وہ اس کے وہیں سب کے سامنے پوچھنے پر کنفیوز سی ہو گئی۔

دلدار نے اس کو ہاتھ کا چھالہ بنا لیا تھا۔ وہ کپڑے استری کرتی تو فوراً اس سے لے لیتا۔ ہاتھ سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا لیتا۔

"میں نے کہا نا' تم کام نہیں کرو گی۔"

"اتنی محبت نہ دو دلدار! مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔" وہ اداس سی ہو جاتی۔

"کس بات کا ڈر؟" وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔

"جدائی کا ڈر۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"جدائی...." اس نے لفظ کو چبایا۔ "یہ کبھی ہمارے درمیان نہیں آئے گی۔ تم میری ہو مہو! صرف میری۔"

اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں۔

✲ ✲ ✲

دوسرے دن کے اخبار میں اس پر فائرنگ کی خبر شائع ہوئی تھی۔ ایڈیٹر کی ذاتی کوشش سے ایف آئی آر کٹوانے اول حسین گیا تھا۔

ثوبیہ اور زیب النساء دوسرے دن ہی پہنچ گئیں۔ وہ دن کے بعد وہ حیدر آباد آ گئے تھے۔

مگر ماروی کے اندر اضطراب تھا' پریشانی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے گم سی ہو جاتی۔ بیٹھے بیٹھے اداسی اوڑھ لیتی۔ وہ محسوس تو کر رہا تھا مگر منتظر تھا کہ ماروی خود اسے بتائے۔ چند دنوں میں اس کا زخم مندمل ہو گیا تھا۔

ہفتہ بھر کی چھٹی کے بعد وہ پہلی بار آفس جانے کے لیے تیار ہوا۔

ماروی نے ڈائننگ ٹیبل پر اس کے لیے ناشتہ لا کر رکھا۔

"تم نہیں چل رہی ہو آفس؟" اس نے اس کو کوئی تیاری نہ کرتے دیکھ کر سوال کیا۔

"نہیں۔" اس نے چہرے پر آئی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑسا۔

"کیوں؟" وہ تھوڑا حیران ہوا۔

"بس ایسے ہی چند دنوں بعد جوائن کر لوں گی۔"

"تھک گئی ہو میری خدمتیں کر کے۔" چائے کا کپ ہونٹوں سے لگانے سے پہلے وہ کھل کر مسکرایا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

سرمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور چند لمحے بغور اسے دیکھتا رہا۔

"نمی کیوں ہے تمہاری آنکھوں میں۔"

"وہ تمہاری جان کے دشمن ہو گئے ہیں سرمد!" کافی دنوں سے دل میں چھپا ہوا ڈر باہر نکل آیا۔

"پھر....؟" اس نے سر گھما کر اپنے دائیں طرف بیٹھی ماروی کو دیکھا۔

"تم یہ جاب چھوڑ دو۔"

"جاب چھوڑ دوں یا مظلوم کی داد رسی؟"

کئی لمحوں تک اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

"میں چاہتی ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے پس منظر میں چلے جاؤ۔ جب حالات سازگار ہو جائیں تو اپنا کام پھر سے شروع کر دینا۔"

"مظلوم ختم ہو جائیں گے یا ظالم ظلم کرنا بند کر دیں گے۔"

"سرمد! وہ تمہارے گھر میں ڈاکہ ڈلوا چکے ہیں' فائرنگ کروا چکے ہیں' وہ اپنا ہر داؤ استعمال کر چکے ہیں۔ وہ اپنے سب حربے آزمانے کے بعد ایک ہی کام کریں گے۔" وہ روہانسی ہو کر خاموش ہو گئی۔

"جو سر جھکے گا نہیں اسے کاٹ ڈالیں گے ہے نا؟" اس کی شکایتی نظریں ایک بار پھر نم آلود ہو گئیں۔

چپ کے لمحے آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔

وہ آنسو پینے کی کوشش کرتی ماروی کو محویت سے تکتا رہا۔

"پتہ ہے عشق کے بعد موت بے معنی ہو جاتی ہے۔" اس کی آواز گمبھیر ہو گئی۔ "عشق مٹا رہتا ہے' فنا

کردیتا ہے اور مٹنے کے بعد کوئی غم نہیں رہتا۔ منصور پھانسی چڑھ جاتا ہے' سرمد قتل ہوجاتا ہے اور مخدوم بلاول چکی میں پس جاتا ہے۔ محبت مقتل گاہ میں کھڑا کردیتی ہے بغیر کسی خوف کے۔"

"مگر وسوسے' اندیشہ محبت زدہ دلوں کو کبھی آزاد نہیں کرتا۔"

"تم فکر نہ کرو' مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا اور تمہارے بغیر تو میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا' جہاں بھی جاؤں گا' تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

وہ لہجے کو بشاش بنا کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر دل نہ جانے کیوں بے کل تھا۔

"پتہ نہیں محبت اتنا کمزور کیوں کردیتی ہے۔" کھانا بناتے یہ بات سینکڑوں بار اس نے سوچی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح ہی صبح باڑے پر آیا' دودھ کی بالٹیاں اپنے ملازم کو دے کر دودھ کی دکانوں پر بھیجا اور خود ملازموں کی تنخواہوں کا حساب کرنے بیٹھ گیا۔ کچھ لوگوں کے اندر داخل ہونے پر اس نے نظریں اٹھائیں اور ساکت ہوگیا۔ اس کے سامنے سردار بہادر خان اپنے لوگوں کے ساتھ پوری بہادری سے کھڑا تھا۔

"سردار۔ آپ۔؟" اسے لگا جیسے بوجھ سے کسی پہاڑی کے اندر دب گیا ہو۔ بمشکل اٹھ کر اس نے اپنے سن ہوتے ہوئے ہاتھ کو سردار کی طرف بڑھایا۔

"تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔" سردار نے بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ "قبیلے کی ساری بہو بیٹیوں کی عزت داؤ پر لگادی ہے۔ اشرف! تم نے اپنے بھائی کا ساتھ دے کر بہت ہی برا کیا۔ کیا تم بھول گئے کہ تمہاری بھی چھ بیٹیاں ہیں اور کل کلاں جرگے میں تمہاری بیٹیوں کو بھی مہو کے بدلے میں سردار کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔" اشرف کی سانس سینے میں اٹکنے لگی۔

"سردار! اگر میں دلدار کا ساتھ نہ دیتا تو وہ خود مہو کو نکال لے جاتا پھر میں کیسے وہاں پر اکیلا رہ سکتا تھا۔ بیٹیاں تھیں میری' میں نے جو بھی کیا مجبوری میں کیا۔" اشرف نے بے چارگی سے کہا۔

"تم اسے روکتے' اس بے وقوفی سے۔" سردار غصے سے دھاڑا۔

"سردار! دلدار عشق کے بے لگام گھوڑے پر سوار تھا۔ میرے روکنے کے باوجود بھی نہ رکتا۔"

"تو پھر اب تم کیا کروگے' بولو۔ ہم تمہارے سروں پر پہنچ چکے ہیں اور لڑکی لے کر ہی جائیں گے۔"

اشرف اس کے سخت لہجے پر اندر سے کانپ گیا۔

"سردار! کچھ مہلت دے دیں' میں دلدار کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے منت آمیز انداز میں سردار کی خوشامد کی۔

"دیکھ' سارے قبیلے کی جو لڑکیاں پڑھتی تھیں' انہوں نے اسکولوں سے اٹھوالی ہیں۔ جہاں جہاں بھی ہماری سرداری کے قبیلے کے لوگ رہتے ہیں' وہاں پہرے دیتے ہیں۔ سارا قبیلہ اس خوف سے نکلنا چاہتا ہے اور اس کے لیے مہو کو واپس کرنا بہت ضروری ہے۔"

"آپ بیٹھیں' سردار!" ساری گفتگو میں اسے پہلی بار خیال آیا کہ سردار ساتھیوں سمیت ابھی تک کھڑا ہے۔

سردار اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سردار! کوئی اور راستہ نہیں نکل سکتا؟" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"دراصل وہ پتہ نہیں دلدار راضی ہو یا نہ ہو۔" سردار کے کڑے تیوروں پر اس نے فوراً" وضاحت دے دی۔

"تو پھر دلدار' مہو کے ساتھ موت کے لیے تیار ہوجائے یا تم جرمانے میں اپنی دو بیٹیاں دے دو۔"

"سردار! ایسا تو نہ کہیں۔ میری بیٹیاں آپ کی بیٹیاں۔ آپ ہمارے قبیلے کے سردار ہیں' ہماری عزتوں کے محافظ۔" اشرف نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"ہاں' میں اپنی ذمہ داری سے واقف ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ میں سردار بھی ہوں اور جرگے کے قانون کا پابند بھی۔"

"سردار! پھر آپ کی کیا رائے ہے؟" اس بار اشرف بے بسی سے بولا۔

"تمہیں یہ ڈر ہے کہ دلدار کو بھی کارو قرار دیا جائے گا۔"

"جی۔ جی۔ سردار۔۔۔!" اشرف نے سر فوراً" اثبات میں ہلایا۔

"دیکھو' یہ فیصلہ تو جرگے میں ہوگا۔ کارو اور کاری دونوں کو موت کی سزا سنادی جائے گی مگر بعد میں تم دلدار کو چھپا کر کہہ سکتے ہو کہ دلدار بھاگ گیا ہے' چھپ گیا ہے جیسے ہی ہاتھ آیا' قتل کردیں گے اور قبیلے میں تمہاری واپسی کی بھی راہ ہموار ہوجائے گی۔ میں پوری کوشش کروں گا جرگے میں تم لوگوں کو بچانے کی۔ آسانی دینے کی مگر ان سب باتوں سے پہلے تمہیں مہو کو میرے حوالے کرنا ہوگا تاکہ جلد از جلد جرگہ بلایا جائے۔"

سردار خان بہادر نے اپنی مونچھوں کے بل انگلی اور انگوٹھے سے مروڑتے ہوئے کہا۔

اشرف کچھ مطمئن ہوگیا۔ "آپ ہمارے بڑے ہیں' سردار ہیں' قبیلے کے باپ ہیں۔ مجھے آپ پر پورا پورا اعتماد ہے مگر چند دن میں دلدار کو آہستہ آہستہ ساری بات سمجھا دوں گا۔ میں نہیں چاہتا وہ مجھ سے بدظن ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے' ہم چند دن یہیں رہیں گے ہوٹل میں مگر تم یہ مت سمجھنا کہ ہماری نگرانی میں نہیں ہو۔ میرے آدمی تمہارے گھر پر بھی نظر رکھے رہیں گے۔"

"حاضر سردار! حاضر' مجھے قبول ہے۔" اشرف نے فوراً" ادب سے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "مگر آپ جب تک یہاں رہیں گے' میرے مہمان بن کر رہیں گے۔ ہوٹل کا سارا خرچا میں اٹھاؤں گا۔"

وہ ادب سے جھکتے ہوئے سردار سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہاں' مجھے منظور ہے تمہاری مہمانی۔" سردار نے اس کا شانہ تھپک کر کہا۔

☼ ☼ ☼

وہ پریشانی اوڑھے گھر میں داخل ہوا تھا۔ دلدار لاؤنج میں بیٹھا مہو سے باتیں کررہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ چھوٹی بیٹی کو کہا۔ "چاچا کو بلا کر لا۔" وہ گئی' دلدار فوراً" اٹھ کر آگیا۔

"جی اوا! کوئی کام ہے؟"

"ہاں' دروازہ بند کرکے بیٹھ جاؤ۔"

"اوا! پریشان لگ رہے ہو؟" وہ پلٹ کر اس کے پاس آبیٹھا۔

"ہاں دلدار! ہم پکڑے جاچکے ہیں اور سردار کے لوگ ہم پر پہرے دے رہے ہیں۔"

اس کی آنکھیں خوف سے باہر ابل آئیں۔

"اوا۔!"

"ہاں دلدار! میں بہت پریشان ہوں۔"

"وہ۔ وہ ہم تک کیسے پہنچے؟"

"سردار خان بہادر کا کمدار پیاز کے ٹرک لے کر لاہور منڈی میں گیا تھا' وہاں سے وہ اپنے ایک دوست سے ملنے بھاول نگر آگیا جو کہ ہمارے ہی محلے میں رہتا ہے۔ اس نے اپنے دوست سے ہمارے بارے میں ساری معلومات لے لیں اور اس نے سردار کو ساری معلومات پہنچادیں۔ سردار اسی وقت اپنے آدمیوں کے ساتھ نکلا اور آج صبح پہنچ گیا۔ وہ میرے باڑے پر آیا تھا۔"

"اوا! اب کیا ہوگا؟"

"تو بتا کیا کریں؟" اشرف نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

"اوا! کیا کوئی بھاگنے کا طریقہ ہے' ہم اسی وقت یہاں سے نکل چلیں۔"

"نہیں دلدار! ہم سخت پہرے میں ہیں۔ سردار بہادر خان اس شہر میں موجود ہے۔ وہ کہتا ہے یا مہو کو حوالے کردیا۔" اس نے گہری سانس لے کر دانستہ بات بیچ میں چھوڑ دی۔

"یا۔۔۔؟" دلدار نے بے تابی سے استفسار کیا۔

"یا۔۔۔" وہ اضطراب سے اٹھا' سینہ مسلا' مٹھیاں بھینچیں۔ "یا مجھے اپنی دو بیٹیاں جرمانے میں دینے کو کہا ہے۔" اس کے منہ سے مشکل سے ان لفظوں کی ادائیگی ہوئی تھی۔

"نہیں ادا! نہیں۔" دلدار غصے سے کھڑا ہو گیا۔ "میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنی خوشیوں کے لیے بھتیجیاں جرمانے میں دے دوں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔

اشرف کے اندر اطمینان اتر آیا۔ قریب آکر اس کے کندھے تھپتھپائے۔

"شاباش' میرے غیرت مند بھائی! مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔ بیٹھو۔"

اس نے شانوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے بٹھایا۔

"دیکھ دلدار! تیری خواہش کے لیے' خوشی کے لیے میں نے سب کچھ کیا۔ باپ دادا کی زمینیں بیچیں' صدیوں پرانا گاؤں چھوڑا۔ برادری سے ناتا توڑا۔ مگر اب میری مان' صرف میری بیٹیاں ہی نہیں' اپنی جان بھی بچا۔ واپس کر دے مہو کو۔"

دلدار کا سر جھک گیا۔ "سردار نے مجھے ضمانت دی ہے کہ وہ تمہاری جان بخشی کرانے میں پوری پوری مدد کرے گا۔"

"کل کو میں نے برادری میں اپنی بیٹیاں بیاہنی ہیں۔ برادری میں واپسی کا ایک دروازہ کھل رہا ہے۔ اسے بند نہ کر۔ دیکھ میرے یار! مرد کے لیے عورتوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ایک چھوڑ دس مل جاتی ہیں۔ میں تمہاری شادی دھوم دھام سے کروں گا' سارے ارمان پورے کروں گا۔ بول کیا کہتا ہے۔ دوسرا راستہ بھی میں نے تجھے بتا دیا ہے اور یاد رکھنا' تیسرا کوئی رستہ نہیں۔ جرمانہ یا مہو میں سے کسی ایک کا انتخاب تمہیں کرنا پڑے گا۔"

اشرف نے اس کی غیرت کو جگانے کے لیے ایک بار پھر جرمانے کا ذکر کیا۔

"ادا! تیری بیٹیاں میری بیٹیاں' تیری عزت میری عزت۔ میں مر جاؤں گا' پر یہ قبول نہیں کروں گا کہ تمہاری بیٹیاں غیر برادری میں جرمانے میں دی جائیں۔" اسے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"شاباش میرے دلیر بھائی!" اشرف نے اٹھ کر اس کو گلے لگایا تھا۔ "تو نے میرا مان رکھ لیا' میری عزت بڑھا دی۔"

☼ ☼ ☼

"مہو! ہم مشکل میں پڑ گئے ہیں' سردار نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے۔"

اس کے ہاتھ سے چائے کا مگ گر گیا۔ اسے لگا چائے کی طرح محبت بھی مٹی میں مل گئی ہے اور مگ کے ریزوں کی طرح اس کی ذات بکھر رہی ہے۔

"دل۔۔۔ دلدار۔۔۔" اس کے ہونٹ کپکپائے۔ دل ڈھول کی طرح وسوسہ و اندیشہ کی ڈنڈیوں سے بج کر اس کی موت کا اعلان کرنے لگا۔ جیسے سندھ کی اکثر ڈھول پر ڈنڈے مار کے کسی بڑی ہستی کے موت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ستلج چڑھ آیا۔

"اب۔۔۔ اب کیا ہو گا؟" دلدار نے اس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے قریب بیڈ پر بٹھایا اور اس کے رخساروں پر بہتے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"مت رو مہو! مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ اس کے گالوں سے آنسو چنتے ہوئے بولا۔ "ہم سردار کے آگے بالکل مجبور ہو گئے ہیں مہو! بالکل بے بس۔"

ہچکیوں کے طوفان میں وہ پتے کی طرح لرزنے لگی۔

"بول نا دلدار! بول اب کیا ہو گا۔" وہ اس کے سینے سے سر ٹکرانے لگی۔

"وہ جرمانے میں بھا اشرف کی بیٹیاں مانگتے ہیں۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"وہ جو کہتے ہیں' سو کہتے ہیں۔ تم کیا کہتے ہو دلدار! مجھے یہ بتاؤ۔" وہ سسک پڑی۔

"ہم کیسے اپنی بیٹیاں ان کے حوالے کر سکتے ہیں۔ کوشش کریں گے کہ جرگے میں فیصلہ ہمارے حق میں ہو۔"

"تو۔۔۔ تو۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔ مجھے ان کے حوالے کر دو گے؟" وہ سناٹے میں آگئی۔ دلدار نے نظریں چرائیں۔

"ہم مجبور ہیں مہو!" وہ رونا بھول کر حیرت سے اس کو دیکھتی رہی۔ بھلا اپنی زندگی کوئی یوں کسی کے حوالے کرتا ہے۔ وہ بھول رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خواب سجانے والا وہ تھا اور ان خوابوں کو تعبیر دینے والا بھی وہی تھا اور اب ان خوابوں کو بے وقعت کر کے ریزہ ریزہ بھی وہی کرنے جا رہا ہے۔

اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ "تم اتنی آسانی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھڑا کر ان لوگوں کو دے دو گے۔ میں نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔

دلدار نے سر جھکا کر ایک بار پھر نظریں چرائیں۔

"تم مجھے مرنے کے لیے بھیج رہے ہو نا' ہاں بولو دلدار۔۔۔!" اس نے شدید صدمے سے اسے دیکھا۔

"تمہاری طلب بس اتنی ہی تھی' تم اتنی آسانی سے مجھے ان کے حوالے کر رہے ہو۔"

"نہیں' سردار خان بہادر ضامن ہے۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"ان وڈیروں سرداروں کے ڈیروں پر ہی تو موت بانٹی جاتی ہے۔ تم اس سردار کی بات کر رہے ہو' وہ تو مجھے سردار خان محمد کے حوالے کر دے گا۔" وہ اسے تکتی رہی۔

"مہو!" اس نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھاما۔

"میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گی دلدار!" جو وہ نہیں کہہ رہا تھا' وہ مہو کہہ رہی تھی۔

وہ خاموش رہا کیونکہ اپنی گویائی سردار کے ہاں گروی رکھ آیا تھا۔

شب ہجراں ان کے وجود پر اتر آئی۔ صبح ہوئی تو وہ تہی دامنی گود میں اٹھائے پھر رہی تھی۔

دلدار نے اس کے لائے ہوئے زیور اور کپڑوں کے چند جوڑے ڈرائنگ روم میں بیٹھے سردار کے حوالے کر دیے۔

وہ اپنے کانوں میں پڑے ہوئے بندے اتار رہی تھی کہ اشرف نے اسے منع کر دیا۔

"نا بھاجائی نا۔! ہمیں اتنا تو ذلیل نہ کر تو ہمارے گھر سے یہی تو لے کر جا رہی ہے۔ بس ہمیں معاف کر دینا۔" اس نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

اس کی بیوی اور بیٹیاں اس کے گلے لگ کر رو رہی تھیں مگر اس کی آنکھوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ ستلج سوکھ گیا تھا۔ اس نے خالی دل' خالی آنکھوں سے دلدار کو دیکھا' وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"میرا پلو اس بے ایمان سے ہی کیوں اٹکا؟"

محبت اس کے اندر تھکی تھکی سانسیں لے رہی تھی۔ اس وقت اسے اس مرد سے شدید نفرت محسوس ہوئی جس کے پیچھے اس نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا جسے اس نے محبت کا آسمان سمجھا تھا' وہ تو زمین کا سراب نکلا۔

وہ اپنے زندہ لاشے کو گھسیٹتی سردار کی گاڑی میں آبیٹھی۔ دلدار نے سر اٹھا کر اسے آخری بار دیکھا جیسے مرے ہوئے کا آخری دیدار کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر سکوت تھا اور موت کی سی خاموشی۔ محبت دلدار کے پیروں میں پڑی سر پٹختی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں آفس کے لیے تیار ہو کر نکل رہے تھے کہ گاؤں سے زیب النساء کا فون آگیا۔

"بیٹا! مہو کا پتہ چل گیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سردار خان بہادر کے حوالے کر دیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ حوالے نہیں کیا' وہ ان تک پہنچ چکے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں' واللہ اعلم حقیقت کیا ہے۔"

"دیکھتا ہوں' اگر نمبر مل گیا تو میں ان سے کانٹیکٹ کروں گا۔"

"ہاں بیٹا! اگر ہو سکے تو ان کی مدد ضرور کرو ورنہ ہم سب کو پتا ہے کہ مہو کا انجام کیا ہو گا۔"

"جی میں جانتا ہوں۔" اس نے بہت تھکی تھکی سانس لے کر سیل فون آف کیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پریشانی کو سرمد کے چہرے پر لہراتے دیکھا۔

"مہو کا پتہ چل گیا ہے۔"

ماروی کی سانس جیسے مٹھی میں آ گئی۔

"سرمد! اب کیا ہو گا؟" اس نے بیگ واپس لاؤنج میں پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ خاموشی سے نمبر ملانے لگا۔

"سیار! ایک کام پڑ گیا ہے تم سے' سردار بہادر خان کا کمدار تمہارا دوست ہے۔ اس کے پاس اشرف یا ولدار کا نمبر ضرور ہو گا' وہ لے کر دو۔"

وہ اپنے دوست کو فون کر کے پھر بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ آفس فون کر کے اس نے اخبار میں رپورٹ دے دی تھی۔

وہ دونوں اپنی جگہ پریشان ہو خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد ولدار کا نمبر میسج میں آ گیا' اس نے فون کال ملائی۔

"ہیلو!"

"ولدار! میں سرمد بول رہا ہوں۔"

"تمہیں مجھ سے کیا کام؟"

"دیکھو' میری بات غور سے سنو' فون بند مت کرنا۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ سردار خان بہادر تم لوگوں تک پہنچ گیا ہے۔"

"ہاں' صحیح سنا ہے۔ وہ مہو کی بانہہ مانگ رہا ہے یا جرمانے میں دو بھتیجیاں۔"

"دیکھو تم کبھی بھی مہو کو واپس نہ کرنا۔"

"تو کیا اپنی بھتیجیاں دے دوں؟" ولدار کی طیش بھری آواز آئی۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔ بیٹیاں کبھی بھی جرمانے میں نہیں دی جاتیں۔ تم ہمت کرو ولدار! سردار سے نکر لو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارا پورا ساتھ دیں گے۔"

"مگر ہم سردار سے وعدہ کر چکے ہیں' وہ آج مہو کو لے جائے گا۔" اس کی مری مری آواز آئی۔

"دیکھو' اگر تم مہو کو واپس نہ کرو تو ہم انسانی حقوق کمیشن سے مدد لیتے ہیں۔ مختلف فلاحی تنظیموں اور عدالت سے رجوع کریں گے۔"

"میں نے کہا نا ہم سردار سے وعدہ کر چکے ہیں۔"

"ولدار! تم اتنا کیوں ڈر رہے ہو' تم تو ویسے بھی پنجاب میں ہو' وہاں تو تمہیں کوئی اتنا زیادہ خطرہ بھی نہیں ہے۔ ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے' ہم اخبارات میں تمہارے حق میں آواز اٹھائیں گے۔ تم جرأت سے کام لو ولدار! ہم جیت جائیں گے۔ قانون ہمارا ساتھ دے گا۔"

وہ لجاجت سے اس کی منتیں کرنے لگا۔

"سرداروں کے مقابلے میں قانون کچھ نہیں۔ یہ قانون تو ہمیں مروا دے گا' ویسے بھی ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم نے سردار کو کہہ دیا ہے' ہم کسی خون خرابے میں نہیں پڑیں گے۔ جرگے کا فیصلہ قبول کریں گے۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"اور جو مہو کا خون بہے گا تو وہ خون خرابا نہیں ہے تمہاری نظر میں؟ ولدار! تم اس سے بے وفائی کر رہے ہو' تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اسے کاری کر کے مار دیا جائے گا۔" اس کا ضبط جواب دے گیا' وہ چیخ پڑا۔

ولدار نے فون بند کر دیا۔ اس نے کئی بار ملایا پھر تھک کر بیٹھ گیا۔

"افسوس' ولدار بہت بزدل نکلا۔ وہ تو کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں' اسے صرف اپنی جان بچانے کی فکر ہے۔" اس کے لہجے میں دکھ در آیا۔

"کیا عورت کا وجود مرد کے لیے صرف ایک خواہش ہے کہ خواہش پوری ہوئی تو بے وقعتی سے اسے سفاک سماج کے سپرد کر دیتا ہے۔"

ماروی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پتہ نہیں محبت کرنے والوں کا یہ کیسا المیہ ہوتا ہے کہ ہر محبت میں ان کو اپنی محبت دکھتی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ سردار بہادر خان کی حویلی کی غلام گردشوں میں کسی ایسی چیز کی طرح پڑی تھی جو استعمال کے بعد ناکارہ ہو کر پھینک دی جاتی ہے اور ایک کاغذ کی پیشانی پر طلاق کا داغ اس کو معاشرے کی بے حسی' ولدار کی بے وفائی کا یقین دلا رہا تھا۔ یہ لفظ اسے قرآن پاک پڑھنے کی وجہ سے سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ گھٹنوں میں چہرہ دے کر اس ایک لفظ پر گریہ کرتی رہی جو عورت کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔

انہوں نے اختتامی وسل بجا دی' کھیل ختم ہو گیا' وہ میچ ہار گئی تھی۔ سرداری نظام سے' مردوں کے معاشرے سے' سماج کی بے حسی سے' وہ اب کھیل کے میدان میں تن تنہا کھڑی تھی۔ اس کا ساتھی خواہش کی شام ہونے پر اپنے گھونسلے میں بحفاظت بیٹھا چین کی بانسری بجا رہا تھا۔ محبت کی اکھڑی اکھڑی سانسیں اسے رلا رہی تھیں۔

"کیا ہو گا؟" کا سوالیہ نشان اسے آسیب کی طرح ڈستا رہا۔ "بس یہ تھی تمہاری محبت کی حقیقت۔" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کاغذ کو اٹھایا۔

ٹرے میں پڑا کھانا اپنی بے وقعتی کا رونا رو رہا تھا۔ پردے اس کی دلیری پر اڑ اڑ کر ہاتھ لہرا کر احتجاج کر رہے تھے۔ کرسیاں اس کی طرح سر جھکائے غم زدہ سی بیٹھی رہیں۔ بیڈ محبت کی طرح اوندھا منہ کیے زمین سے راز و نیاز کرتا رہا۔ قالین فرش کے دہانے میں منہ دیے پڑا رہا۔ گھڑیال دیوار کے سینے پر ٹکا بیٹھا رہا۔

کھڑکیاں وفا کی طرح خاموش سی شرمندہ ہوتی رہیں۔ دروازہ فریب کی طرح آنکھیں کھولے بے شرمی سے اس کو دیکھتا رہا۔

سارے کمرے میں موت کی سوگواری پھیلی ہوئی تھی۔ محبت کی موت پر کمرے کی ساری چیزیں اس کے غم میں برابر کی شریک لگتی تھیں۔

"کیا ہو گیا میرے ساتھ؟" زندگی گھٹنوں پر سر ٹیکے سسکنے لگی۔ محبت کے مرثیے کی لے اس کو چھو کر پھر کمرے کی ایک ایک چیز کو چھونے لگتی۔

"ولدار! تم نے کیا کیا میرے ساتھ؟" اس کے اندر پلنے والا وجود سرسرا کر اسے زندگی کی حرارت محسوس کراتا رہا۔ یہ اس کی محبت کا ثبوت تھا۔

وہ محبت جس کو پانے کے بعد زندگی کی خوشیوں نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا تھا۔

جرگے کی منڈیر پر بیٹھا سیاہ کوا موت کا پیغام دے رہا تھا۔ سردار کی ملازمہ نے رحم کی نظر ڈال کر ٹرے اٹھائی۔

"بے چاری چند دنوں کی مہمان ہے۔"

سردار کی حویلی میں ایسی موت کی مہمان آتی رہتی ہیں۔ پہلی ملازمہ نے دوسری ملازمہ کے کان میں سرگوشی انڈیلی۔ "دکھوں کی ماری نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"چہ۔ چہ۔ کیسے کھائے' کیا اچھا لگے گا بے چاری کو۔ موت سر پر منڈلا رہی ہے۔"

"دعا کرنے کو دل کرتا ہے' کتنی سوہنی لگتی ہے۔" پہلی ملازمہ نے ادھر ادھر دیکھتے کہا۔ دوسری اثبات میں سر ہلانے لگی۔

اور دل ہی دل میں اس کے لیے دعا مانگتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"اس کے بچنے کی صورت کیا ہے؟"

"معاشرے سے' برادری سے' جرگے سے جنگ' قانونی اور غیر قانونی جھگڑا۔"

سرمد نے اس کے ہاتھ سے چائے کا مگ تھاما۔

"قانونی اور غیر قانونی سے کیا مراد ہے؟"

وہ رائٹنگ ٹیبل کی سائیڈ پر پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یار! غیر قانونی یہ کہ کاری کے گھر والے۔ برادری والے اس کے اس شرعی حق میں اٹھ کر ہتھیار اٹھا لیں۔ ان وڈیروں اور جرگے والوں کے خلاف۔ اس لڑکی کو تحفظ دینے کے لیے ہر بندہ میدان میں آ جائے۔

اس سے یہ ہوگا کہ کوئی بھی مفت میں پرائے جھگڑے میں نہیں پڑے گا۔“

سرمد نے مگ اٹھا کر چائے کا گھونٹ لیا۔

”مگر ایسا نہیں ہوگا‘ اس لیے کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔“ وہ افسردہ ہوگئی۔

”ہاں‘ یہ نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ واقعی یہ ہم مردوں کا معاشرہ ہے۔ ہر کوئی کہے گا ”ہم بہو بیٹیوں والے ہیں۔ ہم ایسی لڑکی کی حمایت کریں گے تو کل کلاں ہماری بیٹیاں بھی ایسی روش اختیار کریں گی۔ ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔“ اس نے بہت گہری دکھ بھری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

ماروی اس کے اس اعتراف پر بے ساختہ مسکرادی۔ سرمد کے لبوں کی موہوم سی مسکراہٹ نے اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔

”اور قانونی؟“

”اور قانونی یہ کہ ریاست مکمل طور پر حرکت میں آجائے۔ جرگوں اور اس کے منتظمین اور شرکت کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ انہیں غیر قانونی ٹھہرایا جائے۔ آئین سے غداری قرار دے کر آئین توڑنے والی سزا دی جائے اور پولیس فوری طور پر اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے ان جرگوں کو ہونے سے پہلے ہی روک دے اور قانون شکنی کے جرم میں منتظمین کو گرفتار کرلے۔ عدالتیں ان کی ضمانت ضبط کرکے اپنا کردار ادا کریں۔ ازخود نوٹس لیں اور ایسا ہوگا نہیں۔“

دکھ اس کے لہجے سے سرمد کے آگے ٹپکتا رہا۔

”ہاں‘ ایسا نہیں ہوگا‘ اس لیے کہ جرگے میں فیصلے نافذ کروانے والے بااثر‘ بااختیار جاگیردار ہوتے ہیں یا حالیہ ایم پی اے‘ ایم این اے یا سابقہ ان جاگیرداروں کے سپورٹرز کارندے ہوتے ہیں جن کی حمایت یہ جاگیردار کرتے ہیں۔ ان کی پشت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ یہ جرگے ان کو پاور فل بناتے ہیں۔ یہ جرگے اور پنچایتیں ان کی طاقت کا نشان ہیں۔ یہ سارے فیصلے جرگوں کے ذریعے کروا کے اپنی قوموں‘ برادریوں کو اپنے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ریاست کے قانون سے کھلی غداری ہے۔“

”مگر ریاست کو چلانے اور قانون بنانے والے بھی یہی جاگیردار ہیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی اس کے بچنے کی؟“

اس نے بے بسی سے سرمد کو دیکھا۔

”ہاں‘ ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کاری سے گاڑھی (لال) ہو جائے۔“

”یعنی؟“ اس نے سوالیہ نگاہیں سرمد پر گاڑدیں دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”اس معاشرے کا کوئی مرد اسے قبول کرلے‘ چاہے پیسوں سے خرید کر یا یوں ہی۔ پتہ ہے آریا سماج میں بیوی کو شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جلایا جاتا تھا تب بھی دیور کہتا۔ آجاؤ اس مردے سے زندہ بہتر ہے۔ میں تم سے شادی کروں گا۔“

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”عورت پر ظلم کی تاریخ بڑی لمبی ہے۔ ستی ہو کر‘ کاری ہو کر‘ سنگسار ہو کر‘ مردوں کے ہاتھوں تیزاب میں جل کر مرتی رہی ہے۔“

سرمد کا لہجہ تاسف اوڑھ کر اس کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ وہ خاموشی اوڑھ کر بیٹھ گئی۔

سرمد اس کی خاموشی کو محسوس کرتا رہا‘ سمجھتا رہا۔ وہ کتنے ہی لمحے سر جھکائے متفکر سی بیٹھی رہی جو کہنا چاہ رہی تھی‘ اسے زبان پر لانے کی ہمت کرتی رہی پھر صحرائے تھر جتنا حوصلہ اپنی ذلت میں بھر کے وہ بات زبان پر لے آئی۔

”تم۔ تم اس سے شادی کرلو سرمد‘ کاری سے گاڑھی بنالو۔“

سرمد نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا‘ وہ واقعی ملیر کی ماروی تھی۔ اس کے سینے میں بائیں طرف دھڑکنے والا دل ملیر کی طرح ہی وسیع تھا۔ انسانیت کی خاطر سب کچھ سمیٹ کر بھی سب کچھ لٹانے والا دل۔ دوسروں کے سکھ کے لیے‘ دکھ چننے والا دل‘ کتنا انمول‘ کتنا مہربان دل۔

سرمد کی آنکھیں بے ساختہ بھیگ گئیں۔

☆ ☆ ☆

سردار خان محمد کی اوطاق کے وسیع صحن میں شامیانے لگادیے گئے تھے۔

ان کے قبیلوں کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے سردار‘ وڈیرے اور رئیس صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے پڑی کرسیوں پر دونوں قبیلوں کے لوگ بیٹھے تھے۔ ان سب کی تعداد بارہ سو کے قریب تھی۔ سردار کے نوکر ٹرے میں پانی کے گلاس رکھ کر لوگوں کو پانی پلا رہے تھے۔ دیگیں پک رہی تھیں۔ جرگے کے بعد سب کو کھانا کھلایا جانا تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں بھنبھناہٹ پیدا کر رہی تھیں۔

اختیار نے اٹھ کر جرگے میں اپنی بہن کو ورغلا کر بھگانے کا ذمہ دار دلدار کو ٹھہرایا۔

”ہماری سات پشتوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہمارے خاندان کی کوئی عورت بھاگی ہو۔ ہم کئی پڑھیوں سے سردار کے آدمی ہیں‘ نوکر ہیں‘ غلام ہیں۔ کبھی کسی کو جرات نہیں ہوئی میلی آنکھ سے دیکھنے کی۔ سردار سائیں کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں کو زمانے کی دھوپ سے بچاتا رہا۔ سارے علاقے میں ہماری بدنامی ہوئی ہے۔ ہم ذلیل ہوگئے ہیں۔ ہر طرف یہ ٹھٹھول پھیلی ہوئی ہے کہ سردار خان محمد کے کمدار کی بہن بھاگ گئی۔ یہ صرف ہماری بے عزتی نہیں‘ ہمارے سردار کی بھی بے عزتی ہوئی ہے۔ ہم اپنی عزت اور جان پر تو سب کچھ برداشت کرسکتے ہیں‘ لوگوں کے طعنے‘ لعنت‘ ملامت مگر سردار کے نام پر کوئی حرف غلط ہماری برداشت سے باہر ہے۔“

اختیار کا چہرہ غصے کی شدت سے لال ہو رہا تھا۔

”میں یہاں سب کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر اسے کاری قرار دیا گیا تو بھی میں اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کرکے علاقے کے سارے لوگوں کی عزت کی حفاظت کروں گا تاکہ کل کلاں کسی کی بھی لڑکی کو بھاگنے کی‘ اپنے باپ بھائیوں کی عزت کو نیلام کرنے کی جرات نہ ہو اور دلدار کو بھی ہمارے حوالے کیا جائے تاکہ دونوں کو اکٹھے ان کے جرم کی سزا دی جائے۔“

”بہادری کی بات ہے‘ جرات مند ہے اختیار! واہ سائیں واہ غیرت ہو تو ایسی۔“

جرگے میں بیٹھے لوگوں کے سر ہلنے لگے۔ زبانیں بڑھ چڑھ کر داد کے ڈونگرے برسانے لگیں۔

سردار خان محمد کا شملہ اونچا ہوتا رہا‘ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے کروفر سے مونچھوں کو بل دیتا رہا۔

سرداروں نے اب اشرف کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا۔

”سب سرداروں کو میں باادب ہو کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے تو ان واقعات کا کوئی علم نہیں تھا۔ میں نے تو پانی کی کمیابی کی وجہ سے زمین بیچی اور سب جانتے ہیں کہ میں کراچی کاروبار کے لیے جانا چاہ رہا تھا مگر وہاں حالات اپنے لیے ناموافق دیکھ کر میں پنجاب چلا گیا۔ وہاں پر میرے دوست نے مجھے باڑہ کھول دیا۔ کاروبار میں پیسے لگوا دیے تو میں اپنے بال بچوں کو بھی لے گیا۔ سب کو پتہ ہے کہ دلدار‘ اختیار کا یار تھا‘ اس کے پاس رہتا تھا‘ اس کے ساتھ زمین کاشت کرتا‘ وہ کئی سالوں سے میرے پاس تھا ہی نہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا گل کھلا رہا ہے۔ میں تو ان دونوں کو اچانک اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوگیا۔ میں نے دلدار کو برا بھلا کہا مگر وہ لوگ نکاح ڈلوا کے آئے تھے۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سو مجھے ان کو اپنے گھر میں پناہ دینی پڑی۔“

وہ بڑی عاجزی سے جھوٹ پر جھوٹ گھڑتا رہا۔ قسمیں اٹھا کر ان کو یقین دلاتا رہا۔ قسم جو جھوٹوں کی پناہ گاہ ہے‘ جرگے میں بیٹھے لوگوں کے سر پھر دائیں بائیں ہلنے لگے۔

”بے چارہ صحیح کہہ رہا ہے‘ اس کا کیا قصور۔ کالا منہ کیا تو دلدار نے کیا۔ اب بھائی لڑکی لے آیا تو کیا کرتا۔ گھر سے نکال بھی تو نہیں سکتا نا! روایت کے خلاف تھی یہ بات بھی۔“

”سرداروں کا ہر فیصلہ میری آنکھوں پر‘ میں ان کے

کہے سے باہر نہیں جاؤں گا جو کہیں گے ان پر پورا پورا عمل کروں گا۔"

امینوں کے سر ہلنے لگے۔ سرداروں، رئیسوں اور وڈیروں کے درمیان صلاح و مشورے شروع ہوگئے۔ پھر فیصلہ سنا دیا گیا۔ ولدار اور مہو کو کارو اور کاری قرار دیا جاتا ہے۔ مہو کو اس کے وارث قتل کریں گے اور ولدار کو اس کے وارث یعنی اشرف قتل کرے گا۔ اشرف کا نام کوئی نہیں لے گا اسے اپنے گاؤں میں آنے جانے کی اجازت ہوگی اس کی عزت جان ومال محفوظ ہوگا۔

یہ فیصلہ سب سرداروں، وڈیروں نے خوب سوچ سمجھ کر اور سب لوگوں کی عزتیں بچانے کی خاطر کیا ہے کہ کارو کاری کو عبرتناک سزائیں دے کر آئندہ اس طرح کے جرم کو روکا جائے۔

اور وہیں بیٹھا ثوبیہ کا شوہر علی اصغر اور اس علاقے کے اخبار کا نمائندہ میسجز کے ذریعے ساری صورت حال سے سرمد کو آگاہ کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"انہیں کارو کاری قرار دیا جاچکا ہے۔ ولدار کو اشرف اور مہو کو اختیار قتل کرے گا۔" اس نے میسج پڑھ کر ماروی کو سنایا۔

"پتہ نہیں کیوں ایک امید سی تھی کہ شاید ان کی جان بخشی ہوجائے۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"جہاں فرد کے جرم کی سزا قبیلے کو دی جاتی ہو، وہاں تم کس سے انصاف طلب کروگی۔ ان سے جو پورے قبیلے کو غلام رکھتے ہیں یا اس انتظامی سرکاری مشینری سے جو ان کے دیے ہوئے حرام رزق پر ضمیر بیچ کر ان کی خواہشات کو پالی پڑتی ہے۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ انسانیت اور محبت کے درمیان عجیب کشمکش ہو رہی تھی۔

اس کی محبت سرمد کو بٹتا اور خود سے الگ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی جبکہ اس کا مشن، اس کے اندر موجود فطری انسانی ہمدردی کا جذبہ اس سے اپنی محبت کی قربانی مانگ رہا تھا۔

جرگہ ختم ہونے سے پہلے ہی ان کو کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

"میں سرمد سے کیسے الگ رہ سکتی ہوں، اگر ایک دن بغیر دیکھے یا فون پہ بات کیے گزر جاتا ہے تو لگتا ہے جیسے صدیوں کی دوری آگئی ہے۔ پتہ نہیں محبت اتنا مجبور کیوں کردیتی ہے انسان کو۔"

اس نے سینکڑوں بار سوچی ہوئی بات کو زیر لب دہرایا۔

اس ٹینشن میں بھی سرمد کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

"کیا کہا؟" اس نے بھنویں اچکاتے محبت سے استفسار کیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ خجل ہوگئی۔

"تم اسے کاری سے گاڑھی بنالو۔" وہ سمندر جتنا حوصلہ اپنے آپ میں بھر کے بولی۔

"برداشت کرلوگی مجھے بٹتا ہوا دیکھ کر؟"

اس نے بازو اس کے شانے کے گرد حمائل کیا۔

"کسی بابے کی بات پڑھی تھی محبت کو تقسیم نہ کرو، ضرب دو۔ تقسیم سے بٹتی ہے، ضرب سے بڑھ جاتی ہے۔" وہ محبت سے مسکرائی۔

"پتہ ہے سرمد! تمہاری محبت میں، میں یوں ڈوبی ہوں کہ محبت کو تقسیم نہیں، ضرب دینا آگیا ہے۔ میری محبت بٹے گی نہیں۔ بڑھ کر دوسروں تک پہنچے گی۔ یہ محبت کا فیض جو دوسروں تک پہنچ کر انہیں فیض یاب کر رہا ہے، یہ سب سرمد! صدقہ ہے تمہاری محبت کا۔" اس کی آنکھوں میں محبت امڈ آئی۔

"یہ لو۔" اس نے سیل فون اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ "ذرا اصغر کو کہو، تمہارے حق کا دعوا کرے اور ایڈیٹر صاحب کو کہو کہ سردار خان محمد کے امین سردار نادر سے بات کریں۔"

"ماروی! تمہیں پتا ہے تم کیا کرنے جارہی ہو؟" سرمد نے اسے نرمی سے دونوں شانوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کیا۔

"ہاں، میں جانتی ہوں کہ میں کیا کرنے جارہی ہوں۔" اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں۔

"سرمد! ایسا بھی تو ہوسکتا ہے نا، میں مہو کے ساتھ سوکن نہیں سہیلی بن کے رہوں۔ اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہوگا اور تمہاری ذات سے جس کا بھی تعلق بنے گا، اس سے میں محبت کروں گی۔"

اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"تم پریشان نہ ہو، ہم لڑ کر تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔ تم منصف بن کر اسے اس کے حصے کی محبت دینا، میرے حصے کی مجھے دینا۔"

وہ زبردستی لہجے کو ہلکا پھلکا بنا کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں ماسٹر اصغر علی، سرمد کا چھوٹا بہنوئی ہوں۔"

وہ جرگے میں اٹھ کھڑا ہوا، سردار سامنے بیٹھے تھے جبکہ عام لوگوں نے گردنیں پھیر کر اسے دیکھا۔

"سب کو پتہ ہے کہ مہو بچپن سے اپنے چچازاد سرمد سے منسوب تھی اور مہو کی محبت کی شادی کے بعد سرمد نے بھی شادی کرلی مگر اب میں سب کو آگاہ کرتا ہوں کہ سرمد نے کاری کو گاڑھی بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ سرمد، مہو سے شادی کرے گا اور جرگے کو اپنے قانون کے مطابق سرمد کو یہ حق دینا پڑے گا، اس لیے کہ وہ اس کی منگ تھی۔ میں سرداروں سے، جرگے کے مندوبین سے، امینوں سے گزارش کرتا ہوں کہ فیصلے پر نظرثانی کی جائے۔"

سردار خان محمد نے پہلو بدل کر اختیار کو دیکھا۔ اختیار، اصغر کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔

"فدا حسین! تم بتاؤ کیا کہتے ہو؟" سردار بہادر خان نے اس سے فوراً" رائے لی۔

"اگر ایسا ہے تو فیصلے پر نظرثانی کرنا مناسب ہوگا۔"

فدا حسین آب دیدہ ہوکر بولا۔ اسے یاد آرہا تھا مہو کا بچپن، مہو کو وہ کتنا عزیز رکھتا تھا، اس کے باپ احسان کی لاڈلی تھی وہ اور جب اس کے دادا نے مہو کو سرمد سے منسوب کردیا تو پھر وہ بھی راضی ہوگیا۔ بھول گیا کہ وہ سارا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اچھی لگتی تھی مگر مہو کی خاطر وہ سارا سے دستبردار ہوگیا تھا۔

"اختیار! تم بتاؤ؟"

"جو سردار سائیں کا فیصلہ ہوگا، مجھے وہ قبول ہے۔"

"میرے خیال سے فیصلہ ہوچکا۔ اب نظرثانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔" سردار خان محمد نے کھردرے انداز میں کہا۔

"سائیں! آپ کے دوست ایڈیٹر صاحب کا فون ہے۔" سردار نادر کا کمدار اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

وہ اٹھ کر کونے میں آیا اور چند منٹ بعد اپنے دوست کی دلیلوں سے قائل ہوکر فیصلہ بدلوانے کی پوری کوشش کا وعدہ کرکے اپنے صوفے پر آبیٹھا۔

"سردار خان محمد میرا بہت اچھا دوست ہے، میں اس سے گزارش کروں گا، کاری سے گاڑھی بنانا بھی جرگے کا قانون ہے۔ میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ لچک پیدا کریں۔"

سردار نادر ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ سردار خان محمد نے سردار نادر کے بدلتے لہجے کو فوراً" محسوس کرلیا۔ آئندہ الیکشن میں وہ ایم پی اے اور سردار نادر ایم این اے کے متوقع امیدوار تھے۔ وہ خاموش ہوگیا، زبردستی اثبات میں سرہلانے لگا۔

سردار نادر کی رائے کی اور سرداروں وڈیروں نے بھی تائید کی۔

"صحیح ہے، صحیح ہے۔ یہ بھی جرگے کا قانون ہے۔" غلامانہ ذہنیتوں نے فوراً" رائے بدل لی۔

"سردار نادر خان جو بھی فیصلہ کرے گا، ہم اسے قبول کریں گے۔"

"میں اپنے دوست سردار خان محمد خان کا بہت شکر گزار ہوں، اس نے میری بات کا مان رکھا۔ میں فیصلے میں ترمیم کرتا ہوں کہ اگر سرمد، مہو سے شادی کرکے اسے گاڑھی بنانا چاہتا ہے تو اس پر سے کاری کی سزا ختم

ہو جائے گی' ورنہ دوسری صورت میں یہ سزا قائم رہے گی۔" سردار نادر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سردار خان محمد نے ایک اور چال چلی۔ "جرگے کا یہ بھی قانون ہے کہ کاری کے ورثاء گواڑھی ہونے کی صورت میں پیسے بھی وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔"

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر اختیار کو دیکھا۔

وہ فوراً" اپنی کرسی سے اٹھا۔

"میں گواڑھی کے بدلے سرمد سے دس لاکھ وصول کروں گا۔"

"بالکل صحیح ہے۔ اگر مہرو کے بھائی مہرو کے بدلے پیسے مانگنا چاہتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔" سردار خان محمد نے تائید کی۔

"دس لاکھ زیادہ رقم ہے۔" سردار نادر بولا۔ "لیکن سردار بہادر خان۔۔۔"

"ہاں ہاں' میرے خیال میں زیادہ ہے۔ فدا حسین تم بھی تو بھائی ہو' رقم میں تمہارا بھی تو آدھا حصہ بنتا ہے' تم بولو کتنی چھوٹ دو گے؟" سردار بہادر خان نے اس سے رائے لی۔

"میں اپنے حصے کے پانچ لاکھ معاف کرتا ہوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہمیں منظور ہے۔" سرمد کا میسج پڑھ کر ماسٹر اصغر علی فوراً" اپنی سیٹ سے اٹھ کر بولا۔

"بس ٹھیک ہے' فیصلہ ہو گیا۔ جوں ہی مہرو کی عدت ختم ہو گی' سرمد پانچ لاکھ اختیار کو دے کر مہرو سے شادی کرے گا۔ اگر اس نے رقم کی ادائیگی نہ کی اور مہرو سے شادی سے بھی انکار کیا تو مہرو پر کاری کی سزا بحال رہے گی اور دونوں صورتوں میں ولدار پر بھی کارو کی سزا بحال رہے گی۔ تین دن کے اندر سردار خان محمد' مہرو کو اس کے بھائیوں کے حوالے کرے گا۔"

سب نے فیصلے پر دستخط کیے اور دعا مانگنے کے بعد کھانا لگا دیا گیا۔ عام لوگوں کے لیے باہر ٹینٹ میں اور سرداروں کے لیے سردار خان محمد کے وسیع ڈائننگ روم میں' جہاں آئندہ الیکشن میں اتحاد اور نئے سیٹ اپ میں سیٹ ہونے کے صلاح مشورے ہونے لگے۔

☼ ☼ ☼

اداسی اس کے آس پاس ٹہلتی رہی' غم اس کی آنکھوں سے ٹپکتا رہا۔ بھگوڑی کے لقب کے بوجھ تلے وہ پوری کی پوری جھکی جاتی تھی۔ ترحم آمیز نگاہوں کے بوجھ تلے اپنے وجود کی روشنی کو ٹٹولتی سردار کے گھر سے نکلی۔

کھردری' لمبی سڑک پر آبلہ پا وجود کو لہولہان کرتے سردار خان محمد کے گاؤں پہنچی۔

"سور کی بچی۔" سردار نے اسے گاڑی سے اترتے دیکھ کر تنفر سے کہا۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ سور ساری عمر ان کی غلامی میں مگن رہا' اس کی نظر میں عزت کے سارے پیمانوں پر صرف سردار ہی پورے اترتے تھے۔

وہ آگے بڑھ کر اپنے ہم پلہ سردار خان بہادر کا استقبال کرنے لگا۔

"آپ کی امانت لے آیا ہوں۔" سردار خان بہادر نے اس سے مصافحہ کیا۔

"آپ کی بڑی مہربانی کہ تعاون کیا۔"

"آپ کی عزت میری عزت ہے۔" سردار بہادر نے سردار خان محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بالکل صحیح فرمایا۔ ہم پیڑھیوں سے ایک دوسرے کا مان رکھنے اور عزت کرنے والے لوگ ہیں۔"

"اچھا اب مجھے اجازت۔۔۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ میری اوطاق سے کچھ کھائے پیے بغیر رخصت ہو جائیں۔"

"سردار خان محمد! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی اشرف سے مل کر ولدار کو سزا دینے کا دباؤ ڈالوں گا' اس لیے کہ اشرف آج واپس جا رہا ہے۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے ملازموں سے دور نکل آئے۔

"ایسا ہے تو پھر میں آپ کو نہیں روکوں گا' کوشش کیجیے گا کہ ولدار کو سزا ملے۔ باقی آگے آپ مرضی کے مالک ہیں۔" سردار خان محمد مسکرا کر بولا۔

اس نے الوداعی مصافحہ کیا اور اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"بابا اختیار! سردار بہادر خان کی گاڑی میں ایک بکس ولایتی شربت کا رکھوا دو۔ ہماری اوطاق سے بغیر مہمان نوازی کے جا رہا ہے۔"

بہادر خان نے قہقہہ لگایا۔ "بس' ولایتی شربت کا مزہ ہم اپنے فارم ہاؤس پر لیں گے۔" وہ بکسے میں رکھی چھ بوتلوں کو دیکھنے لگا۔

سردار خان محمد نے اسے بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا۔

"سردار سائیں! میرا خون کھول رہا ہے' اس لڑکی کی وجہ سے اخباروں میں آپ کے خلاف لکھا گیا اور اب یہ لڑکی جرگے کے فیصلے میں بھی بچ گئی۔"

سردار کا باڈی گارڈ جمن زہرناک لہجے میں بولا۔

"خون تو میرا بھی کھول رہا ہے جمن' مگر یہ سب کچھ سرمد کی وجہ سے ہوا اور ہم سردار نادر کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو گئے۔"

"سردار سائیں! آپ کہیں تو میں کوشش کروں۔"

جمن کے مکروہ چہرے پر خباثت در آئی۔

"کس بات کی؟" سردار نے گھور کر بڑے غصے سے اسے دیکھا۔

"سرمد کو ناکام کرنے کی۔"

"وہ کیسے؟" سردار مونچھیں سنوار کے اسے بغور دیکھنے لگا۔

"سردار سائیں! سنا ہے کہ شہر کی چھوکری سے بھی اس نے عشق کر کے شادی کی ہے۔ ہم کہیں گے کہ مہرو سے شادی کرنے سے پہلے اسے طلاق دے' دے گا تو بھی فتح ہماری۔ نہیں دے گا تو بھی فتح ہماری۔"

"کیسے' کھل کے سمجھاؤ۔" سردار پُراشتیاق انداز میں اس کے قریب آ گیا۔

"سائیں! آسان سی بات ہے' اس لڑکی کو طلاق دے گا تو ہی مہرو سے شادی کرے گا نا' ورنہ مہرو کا فیصلہ بندوق کرے گی۔ دونوں طرح سے ہارے گا تو وہی نا۔ بڑا آیا انسانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والا۔"

وہ خباثت سے بولا۔

سردار خان محمد کا قہقہہ بلند ہوا۔

"شاباش جمن! تو ہمیشہ دور کی کوڑی لاتا ہے۔ سرمد ہم سے ٹکرایا ہے' ریزہ ریزہ تو ضرور ہو گا۔"

وہ ولایتی شربت پینے لگا اور جمن کو پیار سے گالیاں دینے لگا اور سرمد کو غصے سے۔

اس پر نشہ چھا رہا تھا۔ "نشہ" جو کہ سمجھ بوجھ سے دور لا پھینکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کی زندگی کی طرح ہی زرد شام تھی' جب وہ فدا حسین کی جیپ میں آ کر بیٹھی۔ اس نے ایک بار بھی سر اٹھا کر فدا حسین کو دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔

فدا حسین خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا' ان دونوں بہن بھائی کی زبان پر چپ کی کائی جمی ہوئی تھی۔ خوفناک مستقبل کے اندیشے ذہنوں کو جکڑے ہوئے تھے۔

جیپ گھر کے باہر رکی' وہ اتر کر اندر داخل ہوئی تھی متجسس نظریں اس کے جسم میں پیوست ہونے لگیں۔

وہ نظریں جو اس کی طرف اپنائیت سے اٹھتی رہتی تھیں' آج کیسی چبھن تھی ان میں۔ کتنا تمسخر۔ ایک فائزہ کی نظروں میں اسے ترحم کا سایہ نظر آتا تھا اور فائزہ نے ہی اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لا بٹھایا تھا جیسے اس نے فائزہ کو بٹھایا تھا۔

وقت کتنا ظالم اور کٹھور ہوتا ہے اور کتنا منتقم مزاج۔

"مت روؤ' کیوں روتی ہو؟" فائزہ اسی کی طرح اسے دلاسا دیتی رہی۔ "کوئی جرم نہیں کیا تم نے۔ اللہ سائیں نے تمہیں حق دیا ہے اس کا۔" اس کے الفاظ مہرو کے زخمی شرمندہ وجود پر پھاہے رکھتے رہے۔

وہ چائے بنا کر لے آئی۔ "تو یہ بسکٹ کھاؤ' چائے پیو۔"

اس نے نظر اٹھا کر فائزہ کو دیکھا۔ اس گھر میں پہلی بار اس نے نظر اٹھائی تھی۔

"دلدار بے وفا اور بزدل نکلا۔ سرمد سر توڑ کوشش کرتا رہا۔ اس کو سمجھایا کہ ہم اپنے حق کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ عدالت' قانون' میڈیا اور انسانی حقوق کی تنظیموں کا سہارا لے کر۔ وہ بھاڑیہ (بزدل) نہیں مانا۔ شاید اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔"

اس کے آنسو یک دم رک گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑے فائزہ کو دیکھ رہی تھی۔

"مجھے یہ سب باتیں چاچی زیب النساء کی زبانی پتہ چلی ہیں' جب اختیار گھر نہیں ہوتا' تب میں کبھی کبھار اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔ اس کی بہو ماروی بڑی اچھی ہے۔ شادی کے بعد آئی تھی یہاں پر' سب میں گھل مل گئی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ باہر سے ہے' جیسے ہمارے ہی خاندان کی ہو۔" فائزہ اس کا دل بہلانے کو گاؤں میں جو کچھ تبدیلی یا واقعات ہوئے تھے' بتاتی رہی مگر اس کا ذہن تو وہیں اٹک گیا تھا۔ "دلدار نہیں مانا" اس نے صاف جواب دے دیا' اپنی جان بچالی۔" وہ سکوت اوڑھے بیٹھی رہی۔ فضا میں خاموشی ٹہلتی رہی اور موت کی سی سوگواری اس کے چاروں اطراف گردش کرتی رہی۔

"کہاں ہے وہ بدذات' خبیث' بے غیرت' ہماری عزت کا سودا کرنے والی؟" اختیار کی دھاڑ نے اس کو جی جان سے لرزا دیا۔

"تمہارے بھائی نے منع کیا ہے اس کو کچھ کہنے سے۔" بھاجائی کی مری مری سی آواز ابھری۔

"ادا! فدا حسین کو تو پتہ نہیں کس نے تعویذ گھول کر پلا دیا ہے کہ غیرت ہی مر گئی ہے اس کی۔ اس بدبخت نے ہمیں ایک ٹکے کا کر دیا۔ چھوڑا کیا ہم میں۔ عزت برباد کر دی' پگڑیاں اچھال دیں ہماری۔" وہ جلتا بھنتا بولتا رہا۔

اور وہ ڈرتی لرزتی کانپتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"نکاح سے پہلے ہم اس کو سب کے سامنے کہیں گے کہ وہ تین بار رلج (برادری) کے سامنے کہے کہ میں ماروی کو طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔" فائزہ کے میسج نے اس کو صلیب پر لٹکا دیا۔

سرمد گاؤں گیا ہوا تھا' وہ آفس سے سیدھی ہال اور نانی کے پاس آگئی۔ تھوڑی دیر ان سے باتیں کیں پھر اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ جب وہ گاؤں گئی تو فائزہ کے ساتھ اس کی ہمدردی دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

اس دوستی نے اس کو بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ وہ بروقت خطرات سے آگاہ کر دیتی تھی۔ اختیار فائزہ سے دوبار لڑا بھی تھا کہ ماروی سے دوستی توڑ دو مگر فائزہ نے اس کو صاف جواب دے دیا۔

"میرے لیے جینے کے کچھ راستے تو کھلے رکھو۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔"

اور اختیار پتہ نہیں کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔

وہ کس دوراہے پر آ کھڑی ہوئی تھی' اس کے اعصاب اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"تو ماروی مرتضیٰ! اب سرمد کا نام بھی تم سے چھننے کو ہے۔" وہ مقدر کے مذاق پر حیران و پریشان اذیت کے جنگل میں بھٹکتی رہی۔

وہ چند دن سے گاؤں میں تھا' صرف دو بار فون کیا تھا۔ ایک پہنچنے کے بعد خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کا' دوسرے میں اس کا حال دریافت کرنے کے بعد صرف اتنا کہا تھا کہ یہاں سازش ہو رہی ہے۔ کاری سے گاڑھی کے فیصلے کی ناکامی کی۔

"تو یہ بات تھی جو وہ مجھے کھل کر نہیں بتا رہا تھا۔" اضطراری کیفیت میں اس نے فائزہ کا میسج سرمد کو فارورڈ کر دیا۔ اس نے فوراً" کال کی۔

"ہاں' وہ کہتے ہیں' میں تمہیں طلاق دوں۔" سرمد کی آواز نے اس کی رگوں سے خون نچوڑ لیا۔

"اور اگر وہ اپنی شرط سے نہ ہٹے تو پھر؟" خوف کے آکٹوپس نے اس کو اپنے چنگل میں جکڑ لیا۔

"پھر ...؟" سیل فون پر اس کی آواز پہ طاری کپکپی نے سرمد کو خاموش کر دیا۔

وہ سیل کو تکتی رہی۔

"پھر تم بتاؤ ماروی!" سکوت کو سرمد کی آواز نے توڑا۔ "میں تو مقتل گاہ میں کھڑا ہوں' خود کو بچاؤں یا تمہ کو؟" اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

ماروی نے لب دانتوں تلے دبا کر سسکی کو روکا اور فون آف کر دیا۔

اسے لگا کہ بھٹکی روح کی طرح وہ مکلی میں بھٹک رہی ہے' جہاں سب کچھ دفن ہونے جا رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ سارا دن اس کمرے میں پڑی کبھی غیرت کی دیواروں میں خود چنتا محسوس کرتی۔ کبھی چھت کو اپنے اوپر گرتا۔

اس نے ازلوں سے سوئے ہوئے عورت کے مقدر کو جگانے کی ایک ناکام سعی کی مگر وہ جاگا ہی نہیں۔ الٹا اسے بھی اپنے ساتھ ہمیشہ کی نیند سلانے کو ہاتھ بڑھا دیا۔ پتہ نہیں کتنے دن ہو گئے تھے' فائزہ اس کا بہت خیال رکھتی۔ گھر کے باقی افراد اس سے بات نہیں کرتے تھے۔ اختیار کی گالیوں سے زیادہ اس کو فدا حسین کی خاموشی کھلتی۔ وہ چاہتی تو وہ بھی گھر کے دوسرے افراد کی طرح اسے برا بھلا کہے' گالیاں دے تاکہ وہ اس سے بھی دوسرے لوگوں کی طرح بے نیاز ہو جائے مگر اس نے اس کے سامنے زبان کھولی بھی تو صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

وہ خاموش اجڑی نظروں سے اسے دیکھے گئی' صرف ایک بار فریاد کی صورت اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"اختیار نے میری گود اجاڑ دی۔"

پھر وہ عورت کے مقدر کی طرح خاموش ہو گئی۔

اختیار جب اسے گاڑی میں بٹھا کر لے جانے لگا تھا تو اس نے سوچا تھا وہ اسے کسی جنگل میں لے جا کر قتل کر دے گا پھر وہیں گڑھا کھود کر بغیر کفن کے دفن کر دے گا۔ کاریوں کا یہی مقدر تھا۔ یہی ہوتا آ رہا تھا مگر وہ اسے ایک نرس کے پاس لے آیا تھا۔

"بات تو مشکل ہے' بچے میں جان پڑ چکی ہے۔"

"خدا کے لیے' ادا! خدا کے لیے ایسا نہیں کرو۔" وہ سب سمجھ کر گڑگڑانے لگی۔

"چپ کر کتیا' اس کمینے کا بچہ پیٹ میں لیے ہمارے گھر میں رہتی ہے۔"

"خدا کے لیے مجھ پر ایسا ظلم مت کرو۔" وہ اب نرس کے آگے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولی۔

"دیکھو مائی! ناجائز کوئی بھی عزت دار نہیں رکھتا۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

"یہ میرا جائز بچہ ہے۔ ہم نے نکاح کیا تھا۔" وہ چیخی۔

اور اسے یاد آیا تھا کہ وہ بے ہوش ہوتے ہوئے بھی مزاحمت کر رہی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ گاڑی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اذیت کا شدید احساس اس کی رگ رگ میں اتر گیا تھا۔

"اختیار! تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے بولی۔

"ہاں اچھا تو تم نے ہمارے ساتھ کیا تھا نا!"

گاڑی گھر کے قریب رکی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے باہر گھسیٹا۔

وہ چلنے کے قابل نہیں تھی' اسے گرتا پڑتا دیکھ کر بھاجائی کو رحم آ گیا۔ وہ اسے تھامے کمرے تک لے آئی۔ وہ بلک بلک کر روتی رہی۔

"یہ بچہ ہمارے پیار کی نشانی ہے۔ ہم اسے بڑی محبت سے پالیں گے۔"

محبوب' محبت اور اب نشانی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ کفارے میں اپنی جان بچالی تم نے۔"

اس کے لویں لویں سے درد سسکیاں بن کر ابلتا رہا۔

☼ ☼ ☼

جناح ٹرمینل پر اشرف اسے چھوڑنے آیا تھا۔ رخصت ہوتے اس نے دلدار کو گلے لگایا۔

"جب تو لوٹ آئے گا' تب میں تیری شادی دھوم

دھام سے کراؤں گا۔ وقت کی دھول میں سب کچھ چھپ جاتا ہے۔ میں انتظار کروں گا' چند سال بعد تو لوٹ آنا' تب تک میں اپنی بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہو جاؤں گا اور اگر گاؤں میں حالات سازگار نہ ہوئے تو کہیں اور چل کر رہیں گے دونوں بھائی۔" وہ اس کی پیٹھ تھپک رہا تھا۔

اور اب وہ جہاز کی سیٹ سے ٹیک لگائے اپنے اندر بڑا اطمینان محسوس کر رہا تھا کہ زندہ صحیح سلامت بچ کر واپس آنکلا ہے۔ سردار بہادر خان نے ان سے کیا ہوا وعدہ نبھا دیا۔ اس کا پاسپورٹ بنوا کر نہ صرف دوبئی کا ویزا لگوا دیا بلکہ وہاں اپنے کسی جاننے والے کو اس کی ملازمت کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔ ان سارے کاموں کے لیے انہوں نے سردار کو تگڑی رقم تھمائی تھی۔

اشرف پھر سے گاؤں میں سیٹل ہو گیا تھا۔ اس کی دو بیٹیوں کی قریبی رشتہ داروں میں منگنی ہو چکی تھی۔ وہ سیٹ تھے' خوش تھے۔

"کیا کرتا میں' جان ہے تو جہان ہے۔ جان تو سب کو پیاری ہے نا!"

وہ اپنے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ بھی پڑنے نہیں دیتا تھا۔ کبھی مہو اسے یاد آئی مگر اس کے ساتھ وہ اپنی جان بچ جانے پر شکر بھی ادا کرتا۔

"تم دونوں کو ہم کہیں باہر بھیج دیں گے مگر تم مہو کو واپس نہ کرو۔"

سرمد کی بات اسے یاد آئی' اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ مہو کو یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"جو بھی ہو اس کے ساتھ اس کا نصیب۔"

وہ اطمینان بھری سانس لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک اچھا مستقبل اس کا منتظر تھا۔ دبئی کی روشنیوں کی جھلمل چکا چوند میں وہ خود کو گم کر دینے والا تھا۔ شاید اسے بھول کر بھی خیال نہ آتا کہ اس نے ایک لڑکی کو محبت کے جال میں پھنسا کر اس کی ذات سے خوشیاں کشید کر کے اسے ظالم سماج کے سپرد کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فائزہ اسے مہو سے ملانے لے گئی تھی' اس نے بتایا تھا کہ مہو اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اختیار گاؤں سے باہر گیا تو اسے موقع مل گیا۔

وہ اجڑی آنکھوں' اجڑے دل اور اجڑی گود میں ہاتھ دھرے اسے دیکھتی رہی۔

"میں نے اس سے کہا تھا۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتی مگر اس نے بے وفائی کی سرمد! اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔" آواز ہچکی اوڑھے اس کے گلے سے نمودار ہوئی۔

"مرد کتنے کمزور ہوتے ہیں۔ میں نے اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا' رسوائی سے دامن بھر لیا' سر میں دھول ڈال لی' بدنامی کا داغ پیشانی پر لگا لیا' صرف اس لیے پھر بھی اس نے..." وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

"اور اب... تم بھی ماروی سے بے وفائی کر رہے ہو؟"

"میں تمہاری جان بچانا چاہتا ہوں اور ماروی بھی..."

وہ خاموشی سے سرمد کو تکتی رہی پھر خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

"تمہیں پتا ہے میں نے دلدار کی محبت سے کیا جانا' میں نے جانا عشق من کا سفر ہے' روح کا راستہ ہے' ازلوں سے بنا وہ راستہ جس پر انسان ہزار رکاوٹوں کے باوجود بھی چلتا رہتا ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر اپنے اندر بولنے کی توانائی پیدا کرتی رہی "لیکن اس قیمتی جذبے کو سنبھال کر رکھنا چاہیے' معبود حقیقی کے لیے۔ بندے کا عشق تو صرف خواری ہی دیتا ہے۔ رسوائی' بدنامی اور ذلت۔"

وہ غیر مرئی نکتے پر نظریں جمائے' سرسراتے لہجے میں بولتی رہی۔

"میں نے خود کو گنوا کر کیا پایا؟" اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

"میں تو تجھے اَن پڑھ سمجھتا تھا' پر تو تو بڑی سیانی

ہے۔"

"زندگی کو برتو سب کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ سارے علم انڈیل دیتی ہے من کے اندر' بغیر کتابوں' بغیر استادوں کے بھی۔ مجھے اب زندگی سے کوئی طلب نہیں ہے۔"

وہ ہانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے بوندوں کی جھڑی لگ گئی۔

"دلدار سے میں نے عشق کیا تھا' وہ عشق آج بھی میرے اندر زندہ ہے۔"

"تم دلدار سے محبت کرتی رہو' دل پر کسی کا زور تھوڑی چلتا ہے۔ میں بھی تو ماروی سے محبت کرتا ہوں۔"

"مجھے ماروی سے ملواؤ گے نا!" اس نے پہلی بار نظر سرمد پر جمائی۔

"ہاں ضرور۔" وہ زبردستی تبسم کو ہونٹوں تک کھینچ لایا۔

"سرمد! تم اختیار کے کہنے پر ماروی کو طلاق نہ دینا' اختیار تو پیار کا ویری (دشمن) ہے۔" اس کے لہجے میں نفرت سمٹ آئی۔

"میں تم دونوں کے بیچ کبھی نہیں آؤں گی' کبھی نہیں۔"

ماروی کو سرمد' مہو سے ملاقات کے بارے میں بتا رہا تھا' وہ چپ کی چادر اوڑھے بیٹھی رہی۔ بعض دفعہ بہت کچھ چاہنے کے باوجود زبان پر قفل لگ جاتے ہیں۔ خاموشی ہی زبان بن جاتی ہے۔ اس کا ہجر کا پنچھی خاموشی کی شاخ پر آبیٹھا تھا۔ وہ بیس دن بعد آیا تھا۔ یہ بیس دن اس نے کانٹوں پر لوٹتے گزارے تھے۔ اندیشوں اور وسوسوں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم پریشان مت ہونا' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں ان کا کہنا مان لوں۔ میں ان کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دوں گا کہ میں نے طلاق دے دی ہے۔ باقی کا ہم اول سنبھال لے گا اور کوشش یہ کریں گے نکاح ہو جائے۔ اس کے فوراً بعد میں مہو کو لے کر یہاں چلا آؤں گا۔"

وہ اس کے پلو میں دلاسے باندھتا رہا۔

ٹھیک تین دن بعد اس کا نکاح تھا۔ وہ کسی بھی طرح اس کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اس کے بیگ میں کپڑے رکھتی رہی۔ اس کی اجرک' ٹوپی' تولیہ' شوز' واسکٹ' پرفیوم' شیونگ کٹ۔

"کچھ رہ تو نہیں گیا؟" خود کلامی کرتے ہوئے بالوں کو کان کے پیچھے اڑسا۔

"کیوں رکھ رہی ہو اتنا کچھ۔ میں ٹھیک چوتھے دن تمہارے پاس ہوں گا۔" اس نے بوجھل دل سے کہا۔

"پھر بھی ہو سکتا ہے' ایک دو دن لیٹ ہو جائیں۔"

اس نے لاپروائی سے کہنا چاہا مگر پھر بھی لہجہ کپکپا سا گیا۔

"تم کہو تو میں اب بھی فیصلہ بدل دوں۔" اس نے اس کے شانوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر کرسی پر بٹھایا اور دونوں ہاتھ آگے سے کرسی کی بیک پر رکھے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

کمزوری اس پر رینگنے لگی۔ دل چاہا وقت کو مٹھی میں بھینچ لے۔ اس کا محبوب اس کے پاس تھا اور ٹھہرنے کے لیے بھی تیار تھا پھر وہ کیوں جانے دے اس کو۔ آنے والے ہجر کو کیوں آواز دے۔

ایک طرف اپنی خوشیاں تھیں' دوسری طرف ایک انسانی جان۔

وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ انسانیت اور محبت کے درمیان مقابلے میں محبت جیت رہی تھی۔

"جس نے ایک بے گناہ انسان کی جان کو بچایا' اس نے گویا پوری انسانیت کو بچا لیا۔"

فرمان الٰہی اس کے دل پر دستک دینے لگا۔ فیصلے کی ایک ساعت ہوتی ہے' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں آپ جائیں' آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"

وہ مستحکم لہجے میں کہہ کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کا بیگ اس کے ہاتھوں میں تھمایا۔

وہ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

"چلیں' مجھے بھی دیر ہو رہی ہے آفس سے۔"

وہ ریٹی کوٹ جیسی وسعت اپنے دل میں بھر کے بولی۔

"ہم نے انسانیت کو بچانے کا عہد کیا تھا۔ یہ عہد ہماری محبت کا گواہ بھی ہے۔ ہم اپنی محبت کی گواہی کو خود ختم نہیں کریں گے۔"

کھیر تھر کے پہاڑوں کی مضبوط قطار ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

اس نے کھیر تھر کی مضبوطی کے آگے سر خم کر دیا۔

وہ اسے اندر آفس میں چھوڑنے آیا۔ اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور پلٹ گیا۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھی تو ساری مضبوطی تھر کے بھربھرے ٹیلے کی طرح بکھرنے لگی۔ وہ آج کام کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، سوائے اس درد کی لہر کے جو اس کے وجود میں وقفے وقفے سے ابھر کر اس کو بے جان کر رہی تھی۔

"محبت کیا ہے؟ کیا ہے محبت آخر؟ کیسی بے بس کر دینے والی۔" تھکن اس کے پورے بدن پر رینگتی رہی۔

اس کی آنکھوں میں جمع ہونے والی نمی بوند بوند بن کر رخساروں پر تیرنے لگی۔

"اختیار نے زبردستی کی اور مجبور ہو کر سرمد نے مجھے چھوڑ دیا تو...؟" اندر اسی سوال کی تکرار تھی۔ "میں... میں جھلس جاؤں گی اس کی جدائی میں..." وہ زیر لب گویا ہوئی۔ "میں کیسے برداشت کر پاؤں گی اس کی جدائی کو، اس کے بغیر زندگی کو؟"

اس کے بکھرے وجود سے سسکیاں ابلتی رہیں۔

اس نے انسانیت کی خاطر یہ ہجر جھیلا تھا اور اب اندیشے اسے ڈرا رہے تھے، خوف زدہ کر رہے تھے۔

تھکا ماندہ دن اپنا سفر تمام کر کے آرام کرنے چلا گیا تھا۔ رات شام کے شانوں کے پیچھے سے جھانکنے لگی۔

دور کہیں شہر بھنبھور میں سسی سسکتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"انسانی جان کی حرمت کعبہ سے بھی زیادہ ہے۔"

وہ آپس میں بیٹھے ہوئے سارے حالات کو ڈسکس کر رہے تھے۔

"اس نے کیا جرم کیا؟ شادی ہی تو کی تھی نا! اس کی اجازت تو اللہ نے اسے دی ہے پھر اس پر موت کی حد کیوں لگا دی گئی۔" علی اصغر افسوس سے بولا۔

"ہاں مگر اس معاشرے میں اللہ کے قوانین نہیں، جاگیرداروں اور سرداروں کے بنائے ہوئے قوانین چلتے ہیں۔" سارا کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔

"ہمیں اب ہر حالت میں اس کی جان بچانی ہے۔" ادل نے تحمل سے کہا۔ "اور ان کی سازش کو ناکام بنانا ہے۔ کوشش یہی کریں گے کہ پہلے نکاح ہو جائے۔"

"ہاں مگر اس سے پہلے گاؤں میں بات پھیلا دو کہ سرمد نے ماروی کو طلاق دے دی ہے۔" ثوبیہ نے سارا کی بات کی تائید کی۔

وہ شہر سے نکاح کے جوڑے کے علاوہ چند جوڑے اور دوسرا ضروری سامان لے آئی تھی۔

سرمد سب کو خاموشی سے دیکھتا رہا، اس کے اندر بے چینی بڑھنے لگی تھی۔

"وہ اس خوف کا شکار ہے سرمد! کہیں تم اسے طلاق نہ دے دو۔" گل کی آواز کی بازگشت اس کی سماعتوں سے ٹکراتی رہی۔

اختیار کی باتیں ان تک پہنچ رہی تھیں۔

"نکاح سے پہلے ہر حالت میں اسے سب کے سامنے ماروی کو تین بار طلاق دینی پڑے گی۔ زبانی بھی اور تحریری بھی۔"

وہ پریشان تھا۔ "کیا میں اس کو چھوڑ سکتا ہوں؟ کیا کوئی اپنی زندگی کو چھوڑ سکتا ہے۔ میرے دل کو یہ احساس کہ وہ میری ہو کر بھی میری نہیں۔ مار نہیں ڈالے گا؟ اس کو اپنی زندگی سے نکال کر میں موہنجوداڑو بن جاؤں گا۔ اپنے کھنڈر وجود کو لے کر کیسے جیوں گا۔"

وہ اضطراب کے عالم میں کمرے میں ٹہلتا رہا۔

رات سرچھتی اس کی چوکھٹ پر آ پڑی اور ماروی سراپا مجسم بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے موبائل اٹھا کر "کیسی ہو جاناں!" کا میسج لکھ دیا۔

پوچھنے والے تجھے کیسے بتائیں آخر
دکھ عبارت نہیں جو تجھے لکھ کر بھیجیں۔

اس کے جواب نے اس کے سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک بے چینی بھردی۔ وہ گاڑی میں آبیٹھا۔ وہ گاڑی دوڑاتا رہا۔

''کل شام جانے کیا ہونے والا ہے۔'' وہ بے خودی سے اتر کر درگاہ کے باہر کھلے میدان میں آیا۔ سوالیہ نشان اسے ڈراتا رہا۔

پیر سائیں گندا محی الدین کی درگاہ کے باہر صوفی راگ پر لوگ ناچ رہے تھے۔

صوفی کے سوز و ساز کو' اس کے عشق کے انداز کو
سمجھنا دشوار ہے۔

وہ دونوں فنکار ایک ہاتھ میں ایک تارا' دوسرے میں چپڑی بجاتے گاتے کبھی دونوں بازو پھیلا کر کبھی اوپر کر کے اسی ایک ہی جگہ کھڑے گھومتے ناچتے رہے۔ اس کی نگاہ ان پر ٹھہری رہی۔

''ہمیں تو مجازی محبت نے فنا کردیا ہے۔ خدا سے عشق کرنے والوں کا کیا حال ہوگا۔'' اس کی آنکھوں میں سندھو دریا آبسا۔

ذات کا متلاشی آیا یہاں خود کو تلاش کرنے
اس ہمدرد و ہمراز کو سمجھنا تو دشوار ہے

مجمع میں کچھ لوگوں نے سفید' سبز لال نگینوں اور شیشوں والی سندھی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں تو کچھ نے اپنے سروں پر رومال باندھا ہوا تھا۔

وہ مجمع کے ایک کونے میں کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں صوفیانہ کلام کے بولوں پر بار بار بھیگتی رہیں۔ محب کا رشتہ محبوب کے ساتھ آنسوؤں سے بھی تجز جاتا ہے۔

''ہم نا تو ہے اپنے یار کو سجدہ۔''

جانب علی شاہ نے سر اٹھا کر فنکار کو ناچتے' آگے بڑھتے جھومتے دیکھا۔

سرمد کی نظر جانب علی شاہ کی جانب اٹھ گئی' وہ بھی تو کارزارِ ہجر میں محو پیکار تھے۔

''یہ کون ہے جو ہمارے اندر میں بولی بول رہا ہے۔
اللہ کی آواز کو تو سمجھنا دشوار ہے۔''

مسکراہٹ ان کے چہرے پر جھومنے لگی۔

''اللہ کی آواز کو تو سمجھنا آسان نہیں ہے۔''

وہ دہراتے رہے۔ درگاہ کے گنبد پر چمکتی روشنیوں کا عکس جانب علی شاہ کے وجود پر پڑتا رہا اور وہ بھی جانب علی شاہ کی طرح مکمل بے خودی سے جھومتا رہا۔

''پتہ نہیں اللہ کی آواز کس کس کے دل پر محبت بن کر اترتی ہے۔'' آنسوؤں کی دھار اس کے چہرے پر جاری ہوگئی۔

ہجر کی رات کٹ چکی تھی' سپیدی سحر نمودار ہوئی تھی۔ ملگجا سا اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

٭ ٭ ٭

مسافرت اداسی لیے رات اس کے فلیٹ میں اتر آئی تھی۔

کیا حال سناواں دل دا
کوئی محرم راز نہ مل دا

کی گونج رسیلی روہی سے اٹھ کر سوہنی سندھ کے قاسم آباد کے اس اپارٹمنٹ تک آپہنچی۔

وہ غیر محسوس طریقے سے اٹھ کر آئینے کے قریب آئی۔ آئینے کے عکس نے اسے بھسم کردیا۔ اس کی پیشانی کسی لمس سے جلنے لگی۔ اس پیشانی پر طلاق کا داغ کلنک کا ٹیکہ بن کر چمکے گا۔

اس کا بس چلتا تو وہ رات کو ٹھہرا لیتی' روک لیتی' منتیں کرتی' پاؤں پڑتی' کوئی بھی جتن کرتی اس رات کو روک لیتیں۔

اس کی پیشانی کو اس داغ سے بچا لیتی مگر رات بہت بے رحم تھی جس نے سسی سے اپنوں کو جدا کردیا۔ مومل سے رانو کو بدظن کردیا۔ وہ رات کی چوکھٹ پر پڑی سر پٹکتی رہی۔

وہ آج کی رات جام شورو سے واپس اپنے فلیٹ پر آگئی تھی۔ اس کے کونے کونے میں سرمد کی یادیں پھیلی ہوئی تھیں' وہ کہاں جاتی۔

محبت کرنے والوں کے لیے ان کا محبوب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ پیر بھی' مرشد بھی' درگاہ بھی خانقاہ بھی' دم بھی دعا بھی' مرض بھی مسیحا بھی' ریاضت بھی رضا بھی' چلہ بھی عطا بھی' دوا بھی متاع بھی۔ سب کچھ وہ ہوتا ہے' سب کچھ اور اس سے اس کا سب کچھ ہی تو لٹ رہا تھا۔

کیا آج کے دن کے بعد اس کا نام بھی مجھ سے چھن جائے گا؟

وہ پژمردہ' مضمحل اس کمرے کے کونے میں پڑی رہی۔ اسی کمرے میں بسیرا کی ہوئی یادیں ایک ایک کر کے آکر اس سے گلے ملتی رہیں۔

صبح کے سویرے سے اسے خوف آرہا تھا۔ صبح کا سویرا پتہ نہیں اپنے دامن میں کیا چھپائے ہوئے تھا۔

٭ ٭ ٭

اختیار ابھی ابھی سردار کی اوطاق سے آیا تھا' جہاں جمن نے اس کو بڑی ہمدردی سے وہ ساری باتیں بتائی تھیں جو گاؤں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

''یار! تمہاری عزت ہماری عزت ہے۔ ہم تمہارے ہر عمل میں تمہارے ساتھ ہیں۔ سردار کو اور ہمیں کبھی خود سے الگ نہ سمجھنا۔ ہر مشکل میں تمہارا ساتھ دیں گے۔''

وہ اس کے کاندھے تھپکتا رہا۔

''یار جمن! میرے تو اندر میں آگ لگی ہوئی ہے۔ مت پوچھ' میں کیسے جل رہا ہوں۔'' اختیار نے سینہ مَل کر کہا۔

''ہاں یار!'' جمن نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''دیلی سکون کیسے ملے گا۔ غیرت پر دھاڑا (ڈاکا) ہوا ہے' کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔ تم تو سگے بھائی ہو مہوکے مگر سچ پوچھو تو ہم بھی سر اٹھا کے چلنے کے قابل نہیں رہے۔ لوگ کہتے ہیں سردار کے کمدار کی بہن بھاگ گئی ہے۔ ہم تو شرم سے زمین میں گڑ جاتے ہیں۔''

وہ ہمدردی' تاسف اور غم سے کہتا رہا۔

اختیار کے اندر غصہ بھرنے لگا۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

جمن نے اپنا کام کردیا تھا۔ وہ گھر آکر بھی بے چین رہا۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی۔

''کمدار کی بہن بھاگ گئی' کمدار کی بہن بھاگ گئی۔'' پورا گاؤں اس جملے کی تکرار کی گونج میں گونجتا رہا۔

''ہونہہ... بڑا آیا پرائی چھوریوں کو تکنے والا۔ سچ کہا اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے' خود اس کی بہن اس کی عزت کو نیلام کرگئی۔''

سرگوشیاں آہستہ آہستہ ابھر کر سارے گاؤں میں پھیل رہی تھیں۔

''پتہ نہیں کس کس کی بیٹی کا راستہ روکا ہوگا اس نے اور نہ جانے کتنی عورتوں کو سردار کے ڈیرے پر پہنچایا ہوگا دھوڑ (دھول) پڑ گئی اسی کے منہ میں۔''

سرگوشیاں قہقہوں کا لبادہ اوڑھ کر دیوانہ وار ناچنے لگیں۔

اس نے بے اختیار سر جھٹکا۔ ان سرگوشیوں کی گونج سے پیچھا چھڑانے کی بے سود کوشش کی۔ اس نے زبیدہ کو زبردستی سردار کے ڈیرے پر پہنچایا تھا جس کا شوہر قرض میں رہن رکھا ہوا تھا سردار کے پاس۔

''خدا کے لیے کمدار! مجھے چھوڑ دے' تجھے خدا کا واسطہ۔ اپنی ماں بہنوں کے واسطے چھوڑ دے۔''

زبیدہ کی منتیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں۔ وہ ہیجانی کیفیت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اب دیکھیں گے کمدار کی غیرت' بہت سوں کی غیرتوں کے اسی نے فیصلے کروائے ہیں۔''

طعنے اس کا گلا گھونٹ رہے تھے' وہ گہری گہری سانس لینے لگا۔ لوگوں کی طنزیہ استہزائیہ باتیں اس کے گلے میں پھندے کی طرح چبھنے لگیں۔

اس نے بندوق اٹھائی' اس کی دوسری بیوی اس کے اٹھنے پر جاگی تھی۔ اس نے بندوق کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔

''اگر ذرا سی بھی آواز نکالی یا میرے پیچھے آئی نا تو تجھے اسی وقت ختم کردوں گا۔ سمجھی۔'' اس نے نال سے اسے دھکا دیا۔ وہ خوف سے کانپتے اپنا بیٹا اٹھا کر اس کو تھپکنے لگی۔

وہ باہر نکل آیا۔

”وہ اس لائق کب ہے کہ اس کی شادی ہو' اس کی شادی تو موت سے ہونی چاہیے۔“

✲ ✲ ✲

نیند تو مدت ہوئی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی مگر آج تو بے کلی ہی اور تھی وہ اضطراب کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”پتا نہیں کیوں مجھے سکون نہیں مل رہا۔“

اس کے لئے بیٹے خیمہ وجاں میں ہر طرف درد بکھرا پڑا تھا مگر ان سب دکھوں کے باوجود دل محبت کے لٹ جانے پر ماتم کر رہا تھا۔ وہ اسی کمرے میں جو پہلے اس کا تھا' میں بیٹھی رہی۔ فائزہ نے تکیے سے سر اٹھا کر دوبار غنودگی میں اسے سونے کی تلقین کی پھر بے خبر ہو کے سو گئی۔

رات جان کنی کا درد سہہ رہی تھی۔ کچھ لمحے بیتنے پر سپیدۂ سحر نے رات کا نقاب الٹا تو وہ اندر کی گھٹن سے گھبرا کر باہر نکل آئی۔

سامنے اختیار بندوق تانے کھڑا تھا' وہ چونکی۔

” تو نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا' سارا راج ہم پر تھوک رہا ہے۔“

اختیار کی غصے و نفرت سے کانپتی آواز نے اس کی سماعت کو موت کا پیغام دیا۔

وہ اندر کمرے میں بھاگ کر کنڈی لگا دینا چاہتی تھی مگر وہ عین دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اردگرد نظر دوڑائی' کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ منصور نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا تو موت اس کا مقدر ٹھہری۔ وہ کس جرم میں سزاوار ٹھہری تھی' اس نے چیخنا چاہا مگر خوف نے آواز سلب کر لی۔ کبھی دائیں' کبھی بائیں۔ اس کا ایک قدم بھی سیدھے راستے پر نہیں پڑا۔ مسلسل گولی کا نشانہ چوکتا رہا مگر ایک گولی اس کے کان کے قریب موت کا پیغام چھوڑ کے آگے نکل گئی۔

”دلدار۔۔۔“ اس کے لبوں پر پیاس بن کر یہ نام آیا۔

محبت سراب نکلی تھی اور اب اس کا دم لبوں پر آ گیا تھا۔

گلیاں پریم نگر دیاں
حضرت عشق تھمایم
(پریم نگر کی گلیاں مجھے حضرت عشق نے تھمائی ہیں)

دلدار تیبل بجاتا آنکھیں بند کر کے گاتا رہا۔

اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی۔

”مار ڈالنا چاہتا ہے مجھے؟ مار ڈال۔ موت اور محبت سے کون بھاگ سکتا ہے۔ یہ دونوں ازلوں کا لکھا ہوا گیت جن کو نہ چاہتے ہوئے بھی گنگنانا پڑتا ہے۔

گلیاں پریم نگر دیاں
گلیاں پریم نگر دیاں
گلیاں پریم نگر دیاں
گلیاں پریم ۔۔۔۔۔۔۔

اس کا گلا رندھ گیا۔ حضرت عشق۔۔۔ سائیں عشق۔۔۔ مرشد عشق۔۔۔ سسکی اس کے اندر سے اٹھ کر لبوں سے ٹکرائی' وہ نڈھال ہو کر گر گئی۔

”تم ہماری عزت کو روندتی ہو ہمیں ذلیل کرتی ہو اور سمجھتی ہو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“

اختیار کے ٹھڈے پر اس کی نکسیر بہنے لگی۔

”گلیاں پریم نگر دیاں۔۔۔“ وہ گنگنانا چاہتی تھی' وہ بلند آواز سے گانا چاہتی تھی۔

”گلیاں پریم نگر دیاں حضرت عشق تھمایم۔۔۔“

وہ چیختا چنگھاڑتا اس کو ٹھڈے مارتا رہا۔

”تمہاری عزت کا جنازہ نکال دیا' سارا راج تھوک رہا ہے ہم پر۔“

یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ وہ جیتی جاگتی عورت ہے جس کو زندگی جینے کا اختیار قدرت کی طرف سے ایسا ہی دیا گیا ہے جیسا اس کو' پھر وہ اس کی عزت کیوں نہیں بن رہی ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے پتہ نہیں کتنی عزتوں کو سردار کی رضا کے لیے روندا ہے' وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے تین شادیاں کر رکھی ہیں اور اس کی بہن نے صرف پسند کی شادی کا گناہ کیا ہے۔

اختیار کی بندوق کے وار اس کے اردگرد محبت کے گیت گا رہے تھے یا فرقت کے مرثیے۔

اس کے اعصاب شل ہو گئے۔ محبت۔۔۔ موت۔۔۔ دلدار۔۔۔ اس کے چاروں اطراف ان تین لفظوں کے گونج دیوانہ وار رقص کر رہی تھی۔

موت بندوق کی نال سے نکل کر اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

”محبت۔۔۔ دلدار۔۔۔ موت۔۔۔“ اس نے آخری ہچکی لی۔

کائنات نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کی سچائی پر سسکی بھری۔

اور حضرتِ عشق کے آگے سر خم کر دیا۔

اور سرزمین سندھ پر روحل فقیر کی کافی گونج رہی تھی۔

گلیاں پریم نگر دیاں۔۔۔۔
حضرت عشق تھمایم۔۔۔۔
جوگی پھیرا لایم۔۔۔۔
سوہنل عشق تھمایم۔۔۔

✲ ✲ ✲

وہ اسی دم درگاہ سے واپس پہنچا تھا۔ چیخیں بلند ہو رہی تھیں لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم چیر کر وہ اندر آیا۔

”مہو مر گئی۔“ جملہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ وہ چبوترے پر چڑھ آیا۔ اس نے فائزہ بھاجائی کو اور سارا ویڑھا یا۔

روتی ہوئی زیب النساء' مہو کا چہرہ گود میں لے کر پٹیاں باندھ رہی تھیں۔ اس کا خون زمین پر اپنی سچائی کے نشان چھوڑ رہا تھا۔ زیب النساء کے آنسو اس کے چہرے پر گر کر اس کی مظلومیت کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہے جو ازل سے عورت کا مقدر بنی اکیسویں صدی تک چلی آئی ہے۔

مہو مر گئی۔ موہن جودڑو کی مہو مر گئی۔

سونہاری (حسن والی) سندھ کی عورت پر یہ کیسا

سیاہ دور آیا ہے' جہاں پسند کی شادی اس کے لیے موت کا پیغام بنادی گئی ہے۔

یہ رسم سندھ کی تو نہیں تھی۔ مگر جاگیرداروں' سرداروں نے اپنا گھٹیا نظام بچانے کے لیے اس گندی رسم کو رائج کر دیا۔

اس دھرتی کی عورت پر' جس کو شاہ سائیں نے اپنی شاعری میں زندہ جاوداں کر دیا۔

وہ شاہ کے کلام کی سات عورتیں' سات سورمیاں بن کر ابھریں جن کو سندھ کے ہر شاعر نے گایا' سراہا ہے۔

جن کی شہرت سندھ کی سرزمین سے پنجاب کی روہی تک پھیلتی چلی گئی' جن کی محبت کی داستانوں کو صوفیوں نے سلوک کے بھیس پہنا دیے۔

اس خوشبودار سندھ کی مٹی میں کاروکاری کی بدبودار رسم کیوں پنپ رہی ہے؟

اللہ کے دوستوں نے صوفیاء کرام نے اپنی محبت کی تشبیہات میں اس سندھ و پنجاب کی سنہری عورت کو کیوں گایا۔

ہیر وارث شاہ' پنجاب میں گونجتی رہی۔ سسی' سوہنی' سورٹھ کا ذکر کیوں ان کے ورد زبان رہا۔

وہ جانتے تھے محبت تو میثاق ہے۔

ان کو پتا تھا کہ اس پر کسی کا زور نہیں چلتا' اس کا سب پر زور چلتا ہے۔

سوچوں کے جھکڑ اس کو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح ماحول سے اڑاتے جا رہے تھے۔

بین' سسکیاں اس کے چاروں اطراف سے ابھرتی رہیں۔

اس کی نظریں مہو کے لہولہو وجود پر جم گئیں' وہ زرد ہو رہی تھی۔

بند ہونے کے باوجود اس کی ادھ کھلی آنکھیں سماج سے انصاف کی طلب گار تھیں۔

اس کا مردہ وجود مردوں کے بنائے ہوئے عزت کے پیمانوں' سماج کے بانجھ ذہنوں' معاشرے کی مردود روایتوں پر کاری ضرب تھا۔

سارے ماحول میں سوگواری سر پٹختی پھر رہی تھی۔

فدا حسین دونوں ہاتھ سر پر رکھے زمین پر بیٹھا رہا۔

اختیار بھاگ گیا' کہاں گیا ہوگا' سردار کے پاس۔

کاروکاری کا آسیب محبت کی مجرم عورتوں کو تلاش کرتا پھرتا تھا۔

قانون نے بے بسی' سماج نے بے حسی اور عورتوں نے بے کسی اوڑھ رکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

سرمد کئی دن تک مصروف رہا' خود ایف آئی آر کٹوائی۔ ہائی کورٹ' سپریم کورٹ کو خطوط لکھے۔ اختیار کی گرفتاری کے لیے تھانوں کے بار بار چکر لگائے مگر وہ روپوش ہو گیا تھا۔

اخباروں میں آرٹیکلز لکھے۔ ہر فورم پر اپنی آواز پہنچائی۔ ماروی بھی مختلف این جی اوز اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی توجہ اس واقعہ کی طرف دلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مختلف سیمینارز' کانفرنسوں اور اجلاسوں میں مہو کے قتل کی مذمت کی جا رہی تھی' انصاف کو پکارا جا رہا تھا۔ مگر نتیجہ کیسے نکلتا؟ اسمبلیوں میں تو جاگیردار اور سردار بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج کتنے دنوں بعد سرمد کی طبیعت سنبھلی تھی۔ دونوں سندھو کنارے چلے آئے تھے۔ ماروی کی آنکھوں کے حلقے گہرے ہو کر اس کے مسلسل رت جگے کو نشر کر رہے تھے۔

"یہ حلقے کیسے' جانِ سرمد؟" اس کے لہجے کی مٹھاس کو محسوس کر کے ماروی کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم کیا سمجھتی ہو' زندگی کی جہد مسلسل میں تمہیں بھول بیٹھا ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں۔" اس نے قطعیت سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے دبایا۔

"نہیں۔ ہم دونوں محبت کو' ایک دوسرے کو نہیں بھول سکتے اور نہ ہی اپنے مقصد کو بھول سکتے ہیں۔" وہ لہجے میں ہنسی بھر کے بولی۔

وہ تنویر عباسی نے کہا تا کہ

باہر گل گلاب جا' اندر میں فولاد

سندھڑی جو اولاد' پرکھے ڈسو کانئرو

ارے ظلم کرنے والے گندے کالے کوؤو

(اس سندھ کی اولاد کو پرکھ کے دیکھ لو۔ یہ باہر سے تو پھولوں کی طرح نرم و خوشبودار ہیں مگر ظالموں کے خلاف فولادی چٹان کی طرح مضبوط ہیں' پُرعزم ہیں۔)

وہ اس کے شعر پڑھنے پر مسکرایا۔

اس کی مسکراہٹ کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔

"میں خزاں کے خوف سے خائف نہیں ماروی! ہم نے بحر ظلمت میں امیدوں کی کشتی اتاری ہے۔ اس یقین کے ساتھ کبھی غم میں زندگی گزارنے والوں کو خوشیوں کا موسم ملے گا۔"

"میری امید کا دیا کبھی گل نہیں ہوا۔ یہاں صرف جمہوریت کا تسلسل رہنے دو۔ تبدیلی آہی جائے گی۔"

"ان شاء اللہ ضرور۔" وہ پورے یقین سے بولی۔ کچھ توقف کے بعد اداسی سے بولی۔

"مگر سرمد! مہو کی موت نے مجھے بہت زیادہ اذیت پہنچائی۔ مجھے لگتا' تمہارا اور مہو کا دل ایک سا لگتا ہے' سورج جیسا روشن دل۔"

وہ اسے چند لمحے تکتا رہا پھر کے بعد افسردگی سے بولا۔

"ماروی۔ تم نے کبھی وحشتوں کا رقص دیکھا ہے۔ نہیں نا' کبھی چلنا میرے ساتھ' میں تمہیں وہ قبریں دکھاؤں گا' جہاں وحشتیں ناچ رہی ہیں۔ محبت کے مجرم بے غسل و کفن گڑھے کھود کر ڈالے گئے۔ ان کی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کو کلہاڑی کی دھار' بندوق کی نال' خنجر کے وار نے چاٹ لیا ہے۔" اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

"ماروی! کبھی ان آنکھوں میں اتر اور دیکھنا جن میں سپنوں کی تعبیر تو دھول بنتی ہی ہے مگر سپنے دیکھنے کے جرم میں وہ آنکھیں ہی سلادی جاتی ہیں۔"

ماروی سرمد کے لہجے کی افسردگی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"ایسا کیوں ہے سرمد۔۔۔؟ سپنے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ خواب تو زندگی جینے کی امید دلاتے ہیں اور لوگ یہ امید بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ کیوں ہو گئی ہے دنیا اتنی ظالم' کیوں؟؟"

سرمد نے اپنے ہاتھ کے پوروں پر اس کے آنسو چنے۔

"ہم زندہ رکھیں گے ان خوابوں کو۔ ساتھی! اگر میں اس سفر میں مارا جاؤں۔۔۔"

ماروی کے ہاتھوں کی گرفت غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھوں پر مضبوط ہوئی۔

"ہر تبدیلی قربانی مانگتی ہے۔ تم ہونا میرا مشن۔۔۔ میرا مقصد آگے بڑھانے کے لیے۔ میں بہت مطمئن ہوں کہ مجھے ماروی ملی ہے۔ ماروی' امید کی علامت' دھرتی کی محبت' عزت کی پہچان ہے۔"

ماروی نے مضبوطی سے پکڑے اس کے ہاتھوں پر اپنی پیشانی ٹکا دی۔

"یہ خواب کی منتقلی کا سفر ہے جو کبھی نہیں رکے گا۔ جب تک پاکستانی قوم جاگیردار' جنرل اور افسر شاہی کی غلامی سے نہیں نکلے گی۔ یہ خواب زندہ رہے گا۔ تعبیر پانے تک۔

چاہے وہ کتنے ہی خواب دیکھنے والوں کو ابدی نیند سلاتے رہیں۔

امید کا دیا سرِراہ جل رہا ہے۔ کبھی تو اس دیے کی روشنی پاکستان کے' سندھ کے کونے کونے میں پھیلے گی۔"

ان کے اندر امر جلیل کے لکھے الفاظ کی گونج پھیل گئی۔ دور دور تک فضا میں ایک ہی آواز کی بازگشت نمایاں ہونے لگی۔

اور وہ آواز گونگے کی تھی۔ بالآخر گونگا (عوام) بول اٹھا۔

"ہم سندھی صوفیوں اور ولیوں کے وارث ہیں اور عشق کے پیمبر ہیں۔ دغا اور فریب کی دنیا میں عشق کے علم اٹھا کر گھومتے ہیں اور عشق کی صلیبوں پر دم دے دیتے ہیں۔"

☆